چک بست لکھنوی

انڈین پریس لمیٹڈ۔ الہ آباد

پہلا اڈیشن ۱۹۲۶ء
دوسرا اڈیشن ۱۹۲۷ء

باہتمام کالی ۔ کے ۔ متر اپرنٹر و پبلشر
انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد

فہرست مضامین

پنڈت برج نراین "چکبست" لکھنوی

پیدائش ۱۸۸۲ء | | وفات ۱۹۲۶ء

حالاتِ مصنّف

بزرگوں کا وطن لکھنؤ ہے پنڈت برج نرائن چکبست ۱۸۸۲ء میں (بمقام فیض آباد)
پیدا ہوئے مگر چند ہی سال بعد لکھنؤ چلے آئے اور وہیں تعلیم پائی ۱۹۰۵ء میں کیننگ
کالج سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور ۱۹۰۷ء میں قانون کا امتحان پاس کرکے وکالت
شروع کردی اس پیشہ میں آپ کو خاصی کامیابی حاصل ہوئی اور آپ کا شمار لکھنؤ کے ممتاز
وکیلوں میں تھا۔ ۱۲ فروری ۱۹۲۶ء کو ایک مقدمہ میں آپ رائے بریلی تشریف لے گئے
عدالت میں بحث کی اور سہ پہر کو لکھنؤ لوٹنے کے لئے اسٹیشن پر آئے۔ ریل میں بیٹھے تھے کہ
دماغ پر فالج گرا اور زبان بند ہوگئی ہمراہیوں نے یہ حالت دیکھ کر ریل سے اتار کر ویٹنگ روم
میں لٹا دیا ڈاکٹر آئے علاج ہوا مگر سب بے سود ۷ بجے شام کو اسٹیشن ہی پر انتقال کیا اور
آپ کے بڑے بھائی۔ رائے صاحب پنڈت مہراج نرائن چکبست ایگزیکٹو آفیسر لکھنؤ
میونسپلٹی۔ گیارہ بجے رات کو آپ کی لاش موٹر میں رکھ کر لکھنؤ لائے۔

جناب کاظم حسین صاحب محشر لکھنوی نے آپ ہی کے مصرع سے تاریخ نکالی ؎

ان کے ہی مصرع سے تاریخ ہے ہمراہ ۱۰۶۱

موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا ۔۔۔ سنہ ۱۳۴۴ ہجری

شاعری کا شوق آپ کو بچپن سے تھا شاید پہلی غزل نو برس کی عمر میں کہی تھی اُس زمانہ سے آپ برابر شعر کہتے تھے۔ اساتذہ میں آتش۔ غالب اور انیس کے کلام کے آپ شیدا تھے اور آپ کی غزل پر آتش اور مسدس پر انیس کی تقلید کا اثر نمایاں ہے خیالات مختلف ہیں مگر سلاستِ زبان بندشِ الفاظ اور حُسنِ ترکیب میں انہیں اُستادوں کی پیروی ہے آپ نے نئے خیالات ضرور نظم کئے مگر زبان اور اسلوب بیان سے لطافت اور پاکیزگی کا جوہر نہیں جانے دیا کیونکہ الفاظ کی بندش سے صنّاعی کرنا (تصنّع نہیں) شاعری کا جزو اعظم ہے ؎

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصّع ساز کا
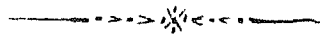
دیباچہ

اِن چند سطور کے لکھنے سے میرا یہ منشاء ہرگز نہیں ہے کہ اردو شاعری کے نشو و نما کی بابت کوئی بسیط مضمون تحریر کیا جائے۔ چند احباب نے جو میری طرح پنڈت برج نرائن چکبست کے کلام کے دل دادہ ہیں مجھسے اصرار کیا کہ اِن کے مجموعۂ کلام پر دیباچہ لکھوں اور ان کے اصرار سے میں اِسکے لکھنے پر آمادہ ہوگیا۔ بہتر تو یہ ہوتا کہ کوئی اور صاحب جو مجھسے زیادہ اس کام کے لئے موزوں ہوتے یہ فرض اپنے ذمّہ لیتے۔

چکبست صاحب کو میں پچیس برس سے جانتا ہوں اور شاعری و انسانی زندگی کا اعلیٰ معیار جو ہمیشہ وہ اپنے مدّنظر رکھتے ہیں اس کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ میں اپنی زندگی کے ان لمحوں کو اپنی حیات کا بہترین سرمایہ سمجھتا ہوں جن میں مجھکو سچّی اور اصلی روحانی مسرّت ان کا کلام پڑھ کر حاصل ہوئی ہے اِن کے اور دوستوں کی طرح مجھ کو بھی اس امر کا افسوس ہے کہ زمانہ نے اس شاعر کو اس قدر فراغت نہیں دی کہ وہ اس فن کی جانب کافی طور پر توجہ کرے جس کے لئے وہ خداداد قابلیت اپنے ساتھ لایا ہے اور جس قابلیت

میں وہ آپ ہی اپنا نظیر ہے۔ قسمت کا یہ پھیر ہے اور عجیب حیرت انگیز قصہ ہے کہ پنڈت برج نرائن چکبست اور سر محمد اقبال کو اس امر کی مجبوری ہو کہ ان دونوں کی شاعرانہ زندگی پیشۂ وکالت کے ساتھ وابستہ رہے۔ عدالتوں کی دریوزہ گری میں تخئیل کا گذر کہاں۔ دونوں میں بُعد المشرقین ہے۔ لیکن باوجود اس کے اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا کہ گذشتہ پچیس سال کے اندر ان دونوں باکمال شاعروں کی ایسی تصنیفات ہوئی ہیں جن کو ایسے شاعروں کے کلام کا ہم پایہ کہنا بیجا نہ ہوگا جس پر اُردو شاعری کو ناز ہے۔ اردو زبان کے آیندہ نشو ونما کے لئے یہ فال نیک ہے کہ اس کی خدمت کے لئے دو ایسے تربیت یافتہ صاحب کمال میسر آ گئے جنھوں نے انگریزی زبان کے بہترین سرماؤں سے فیضیاب ہو کر بھی اپنے وطن کے علم ادب کی محبت کو ہاتھ سے نہیں دیا۔ اور ان کے شمالی ہندوستان کے ہموطنوں کے دلوں میں جو پر جوش خیالات اور پُر درد جذبات ان کے زمانہ میں موجزن رہے ان کو شاعری کا جامہ پہنا کر ایسی زبان میں ادا کیا ہے جس کی تقلید یا تتبع کرنا غیر ممکنات میں سے ہے۔

جیسا کہ شروع میں عرض کیا گیا ہے اس مضمون کی یہ غایت نہیں ہے کہ اُردو شاعری پر کوئی تبصرہ لکھا جائے۔ ایسے تبصرے مجھسے زیادہ قابل اصحاب لکھ گئے ہیں جو اس کے لئے ہر طرح پر موزوں تھے اور جنہوں نے اس کام

کے لئے کافی وقت دیا اور پوری دماغ سوزی کی۔ تاہم چند خصوصیات اس شاعری کی ایسی ہیں جنکا ضمناً ذکر کرنا اس موقع پر بیجا نہ ہوگا۔ ایشیا میں جو اور زبانیں رائج ہیں ان کی شاعری سے اگر مقابلہ کیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ اُردو شاعری بہت حال کی شاعری ہے اور گو کہ اس کا طرز بیان ابتدا میں ہندی زبان سے بہت زیادہ مشابہ تھا۔ لیکن جس قدر زمانہ گذرتا گیا فارسی زبان کے انداز کلام اور قواعد عروض و قوافی کو اس میں بہت زیادہ دخل ہوتا گیا یہاں تک کہ اردو شاعری کی زبان ہی ایک خاص انداز کی نہیں ہوگئی بلکہ بہت کچھ اس کے خیالات کا رنگ بھی بدل کر پارسی ہوگیا۔ اس طریقہ سے اس کو نفع بھی پہونچا اور نقصان بھی ہوا۔ نفع تو اس معنی میں ہوا کہ خاص قسم کے شستہ طرز بیان کی بنا پڑگئی جس نے بہت جلد ایک صورت ممیز اختیار کر لی اور نقصان یہ پہونچا کہ شعرائے اردو کے خیالات ایک دائرہ کے اندر محدود ہو گئے جس کی وجہ سے ان کے کلام پر آورد و تصنّع نے پورا قبضہ کر لیا۔ وہ ایسے تشبیہ و استعارے استعمال کرنے پر مجبور ہو گئے جن کا ہندوستان کی فضا میں کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔ ان میں سے اکثر شاعروں کو خود بھی یہ محسوس ہونے لگا کہ یہ قیود ان کے خیالات و جذبات کے اظہار میں سدِّراہ ہوتے ہیں۔ اُردو شاعری کا زیادہ تر حصہ غزلوں کی صورت میں ہے اور غزلوں کی تصنیف کے لئے جو قیود رکھّے گئے ہیں وہ اُردو

شاعروں کو ناقابل برداشت معلوم ہونے لگے۔ غالب ایسا باکمال اُستاد کہہ گیا ہے ؎

بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے

مثنوی کو لیجئے تو اس کا بھی یہی حال ہے۔ میر حسن اور پنڈت دیا شنکر نسیم نے اپنی پوری قوتیں اس صنفِ شاعری میں صرف کردیں اس میں شک نہیں کہ ان دونوں مثنویوں کی صنعت طرازی اور الفاظ کی جادوگری دلکش اور حیرت انگیز ہے۔ لیکن نفسِ مضمون کو دیکھئے تو نقش برآب و باد رہوا ہے۔ چونکہ اُردو کی اور مثنویوں کا طرز بیان اس قدر دلچسپ نہیں ہے اس لئے ان کا ظاہری رنگ و روغن تو بہت پسندیدہ معلوم ہوتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ آیا ان کو پڑھ کر کبھی کسی دل میں اولوالعزم جذبات بھی پیدا ہوتے ہیں یا ان کے خیالات کی پرواز پڑھنے والے کو کبھی اس عالم کی طرف بھی لے جاتی ہے جہاں حیاتِ ابدی کی کچھ جھلک دکھائی دیتی ہو۔ ایسا بھی تو نہیں ہے کہ ان حسن و عشق کے افسانوں میں کبھی سچّی محبّت کا ترانہ گوش زد ہو۔ جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ غزل اور مثنوی پر تو اُردو شاعری ختم نہیں ہو جاتی اور اصناف بھی تو اس شاعری کے ہیں۔ قصیدہ ان اصناف میں سے ایک صنف ہے۔ فارسی زبان

کے گذشتہ اور حال کے شاعروں میں سے اکثر نے قصیدہ گوئی میں بیشک نام پیدا کیا ہے اور چند اُردو شعرا نے ان کی پیروی میں یہ کوشش ضرور کی ہے کہ اُردو زبان میں بھی اعلیٰ پیمانہ پر قصیدہ نظم کیا جائے۔ لیکن قصیدہ گوئی کا زمانہ اب ختم ہوگیا۔ ایسی نظمیں موجودہ زمانہ کے مذاق کے خلاف ہیں۔ اوّل تو اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ جہاں خوشامد اور اس کی وجہ سے بیجا مدح سرائی کا گذر ہوگا شاعری کے اصلی جوہر نہیں کھل سکتے۔ قصیدہ کا طرز بیان اور بلند پروازی خواہ کتنی ہی اعلیٰ پیمانہ کی کیوں نہ ہو سچی شاعری کا اس میں پتہ نہیں ملتا۔ علاوہ بریں جو مبالغہ آمیز تعریفیں قصیدہ کی روح رواں ہوتی ہیں ان کو اس زمانہ کے خیالات آزادی وخودداری کسی طرح روا نہیں رکھ سکتے۔ اور نہ سرپرستانِ علوم وفنون جن کی تعداد گوکہ پچاس سال پیشتر سے کم ہوگئی ہے۔ اب ایسی مدحت سرائیوں کو پسند کرتے ہیں۔ مسدسوں کی بندش جن میں اس وقت تک مرثئے زیادہ تر لکھے گئے ہیں بیشک اب تک قابل تعریف سمجھی جاتی ہے مرثئے پڑھ کر بیشک ہم لوگ لطف حاصل کرتے ہیں۔ اُن کے مضامین سوز وگداز میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں اور مذہبی لگاوٹ کی وجہ سے ان میں اخلاق حسنہ کا جذبہ ضرور ہوتا ہے انسانی جذبات اور احساس بھی نظم ہوتے ہیں اور سچی شاعری کے اظہار کا موقعہ ان میں کافی ہوتا ہے۔ انیس اور دبیر کے مشہور عالم مرثیوں

نے اُردو شاعری کو ایسا مالا مال کر دیا ہے جس کی انتہا نہیں بتائی
جا سکتی اور اُردو علم و ادب کے شیدائیوں پر ان کا زبردست اثرات تک
جاری ہے - بالخصوص ایسے اصحاب پر جن کا تعلق لکھنؤ کی طرز معاشرت
سے ہے - ما بقی اصناف اُردو شاعری پر تفصیلاً بحث کرنے کی چنداں ضرورت
نہیں معلوم ہوتی -

پنڈت برج نرائن چکبست کا ادبی مذاق خاص الخاص لکھنوی
ہے اور وہ لکھنؤ کے ادبی رنگ میں از سرتا پا ڈوبے ہوئے ہیں فارسی
اور اُردو زبانوں میں ان کی معلومات جامع اور وسیع ہیں - اور اُردو کے
اساتذہ کے کلام پر اُن کو پورا عبور حاصل ہے - ان کے طرز بیان
پر لکھنؤ کی ٹکسالی زبان کی مہر لگی ہوئی ہے - لیکن با ایں ہمہ ان کو دورِ
جدید کے شاعر ہونے کا خاص طور پر امتیاز حاصل ہے ا بہت کچھ حصہ اُردو
شاعروں کے کلام کا جو اُردو شاعری کے نام سے مشہور ہے یا جو اس وقت
اردو شاعری کے نام سے رائج ہے زمانہ موجودہ کے مذاق سلیم کے
موافق نہیں - اس وقت ایسے اصحاب کی تعداد بہت کم یا نہ ہونے کے
برابر ہے جن کو گل و بلبل کے فرسودہ قصوں - اور چاہِ زنخداں ہومیاں
یا دختِ رز کی تعریفوں میں لطف حاصل ہوتا ہو اور نہ کسی کو اُردو شاعری

کے خیالی معشوق کی کج ادائی۔ بے وفائی یا بے پایاں ظلم وستم کے لاطائل قصّے پسند آتے ہیں۔ ایسے معشوق کی سب سے بڑی تعریف یہ ہے کہ اس میں وہ سب اوصاف موجود ہیں جن میں سے ایک کو بھی ہم روزمرّہ زندگی میں کسی طرح روا نہیں رکھ سکتے۔ جو صاحب برج نرائن چکبست کے کلام کو اس غرض سے پڑھیں گے کہ اس میں اُس قسم کی شاعری کے نمونے ملیں جو معیار ماسبق کے مطابق مستند شاعری سمجھی جاتی ہے۔ ان کو بیشک مایوسی ہوگی۔ اس لکھنے سے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ کل پُرانے اساتذہ دائرہ شاعری سے خارج ہیں۔ ان میں ایسے نازک خیال اور باکمال ملیں گے جو اپنے زمانہ کی بد مذاقی سے اپنا دامن بچائے رہے اور جن کی پروازِ خیال نہایت بلند اور قابلِ ستائش ہے۔ میرؔ۔ دردؔ۔ آتشؔ و غالبؔ کے سے باکمال شعرا اس دعویٰ کی دلیل میں بطور مثال پیش کئے جا سکتے ہیں۔ ان کا کلام عام طور پر ان عیوب سے پاک ہے جن کا ذکر پیشتر کیا گیا ہے۔ لیکن ان کا شمار مستثنیات میں ہے۔ عام طور پر اُردو شاعری کا وہ رنگ نہیں ہے جو اُن اُستادوں کا تھا۔ زمانہ حال کی اُردو شاعری کی داغ بیل بالکل نئی اور زیادہ پاک و لطیف سرزمین پر ڈالی گئی ہے۔ اقبال و چکبست کی شاعری کی تحریک کا باعث کبھی تو حُبِ وطن کا

جوش ہوتا ہے اور کبھی کوئی گذشتہ یا حال کا تاریخی واقعہ ان کے خیالات کو پرواز میں لاتا ہے کبھی قدرت کے نظاروں یا مذہبی رازوں کے انکشاف سے وہ اپنی نظموں کو آراستہ کرنے میں مدد لیتے ہیں اور کبھی انسانی جذبات اور احساس کی سچی تصویریں کھینچ کر عبرت کا سبق دیتے ہیں۔ قومیت کا خیال ان کی شاعری کی ساخت کا جزوِ اعظم ہے۔ ان کی شاعری ایسی شاعری ہے جس کا اثر نوجوانوں کے دل و دماغ پر اُس کلام سے کہیں زیادہ ہوتا ہے جو کہ گذشتہ معیارِ سخن کے قاعدوں سے جکڑا ہوا ہے۔ یہ کہنا کہ اس نئے ڈھنگ کی شاعری میں اصلیت کا جزو زیادہ ہے یہ معنی نہیں رکھتا کہ اس میں شاعرانہ تخئیل یا ایجاد کی کمی ہے۔ بلکہ حاصل کلام صرف یہی ہے کہ یہ جزو پُرانے اور نئے دَور کی شاعری کا فرقِ امتیازی ہے۔ برج نرائن چکبست دَورِ جدید کے صرف ترجمان ہی نہیں ہیں بلکہ اِس دَور کے نمائیندوں میں ان کا پایہ بہت بلند ہے۔ اِس دَور کے ترقی کی ممکنات کی کوئی حد نہیں قرار دیجا سکتی ایک خصوصیت اس دَور کی جس کو پُرانے دَور کی مذمّت نہ سمجھنا چاہیئے راستبازی کا شعبہ ہے جس کی مثالیں اقبال و چکبست کے کلام میں کثرت سے ملیں گی۔

میرے اس مضمون کی یہ غایت نہیں ہے کہ اِس دَورِ جدید کے دو نمائندوں اقبال وچکبست کے کلام پر بحث کی جائے اور ان میں فرق دکھلایا جائے۔ لیکن یہ لکھنا بیجا نہ ہوگا کہ اگر چکبست کے بہ نسبت اقبال کے کلام کا رجحان روحانیت اور صوفیانہ مضامین کی جانب زیادہ ہے تو شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ جو اُن کا فلسفۂ زندگی ہے اس کا عکس ان کے کلام پر بھی پڑتا ہے۔ برخلاف اس کے اگر چکبست کے کلام میں زیادہ رنگینی اور درد ہے اور انسانی جذبات ومحسوسات پر اس کا اثر بہ نسبت انسانی دماغ کے زیادہ پڑتا ہے اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ چکبست نے لکھنؤ کی آب وہوا میں نشوونما پائی ہے اور ان پر ان اساتذہ کے کلام کا زیادہ اثر ہے جو لکھنؤ کی ناموری کا باعث ہوئے اور جنہوں نے اُس شہر کی شہرت میں چار چاند لگا دیئے۔ ایسے اصحاب سے جو کسی ایک لفظ یا محاورے کے معنی کی بحث کے پردہ میں دفتر کے دفتر سیاہ کر ڈالتے ہیں نہایت ادب کے ساتھ معافی مانگ کر میں یہ تحریر کروں گا کہ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اعلیٰ درجہ کی شاعری کی مثالیں اقبال وچکبست دونوں کے کلام میں موجود ہیں۔

برج نرائن چکبست کی شاعری وکمال کے ان کے سب ہمعصر قائل

ہیں اور گو کہ جب زمانہ بدلتا ہے اس کے ساتھ مذاق سخن بھی بدل جاتا ہے اور
ایک قرن کی رائے دوسری قرن سے مختلف ہوتی ہے تاہم یہ دعویٰ کرنا کسی
بڑے پیشین گو کا کام نہیں ہے کہ جس قدر زمانہ گذرتا جائے گا اور اُردو شاعری
مصنوعی قیود سے آزاد ہوتی جائیگی اور آزادی کی فضا میں اُس کو نشو و نما
پانے کا موقع ملے گا۔ برج نرائن کی شہرت بتدریج بڑھتی جائیگی اور آئندہ
نسلیں اس امر کو تسلیم کر لیں گی کہ وہ دورِ جدید کے رہنماؤں میں سے ہیں۔

میں نے مندرجہ بالا خیالات بہت ڈرتے ڈرتے ظاہر کئے ہیں
اور اس لئے ذیل میں ایسے کلام کا کچھ نمونہ درج کرتا ہوں جس میں چکبست
کا خاص رنگ نظر آتا ہے اور اس مجموعہ کے پڑھنے والوں پر اس امر کا فیصلہ
چھوڑتا ہوں کہ میرا دعویٰ صحیح ہے یا غلط۔
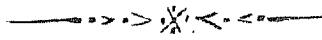
(۱) مرشد کی محبت

پنڈت بشن نرائن در

(نذرانۂ روح)

تیرا بندہ رہے دل سے یہی پیمان رہا　　طائرِ فکر ترے اوج سے حیران رہا

قدر کرنا تری سیکھیں یہی ارمان رہا　　یہی مسلک یہی مذہب یہی ایمان رہا

آبرو کیا ہے تمنّائے وفا میں مرنا

دین کیا ہے کسی کامل کی پرستش کرنا

مجھ سے یارانِ عدم نے یہ اگر فرمایا　　حسرت آبادِ جہاں سے تجھے کیا ہاتھ آیا

میں کہوں گا کہ بس اِک رہبرِ کامل پایا　　زندگی کی یہی دولت ہے یہی سرمایا

لے کے دُنیا سے یہی مُہرِ وفا آیا ہوں

اپنے محسن کی غلامی کی سند لایا ہوں

(۲) قومی نظمیں

خاکِ ہند

اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے　　دریائے فیضِ قدرت تیرے لئے رواں ہے

تیرے جبیں سے نورِ حُسنِ ازل عیاں ہے　　اللہ رے زیب و زینت کیا اوجِ عزّ و شاں ہے

ہر صبح ہے یہ خدمت خورشیدِ پُر ضیا کی

کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیہ کی

وطن کا راگ

پنھانے والے اگر بیڑیاں پنھائیں گے　　خوشی سے قید کے گوشہ کو ہم بسائیں گے

جو سنتری درِ زنداں کے سو بھی جائیں گے　　یہ راگ گا کے انہیں نیند سے جگائیں گے

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے

نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

آوازۂ قوم

ہے آج کل کی ہوائیں وفا کی بربادی　　سُنے جو کوئی تو سارا چمن ہو فریادی

قفس میں بند ہیں جو آشیاں کے تھے عادی　　اُڑا ہے باغ سے بو ہو کے رنگ آزادی

ہوائے شوق میں غنچے بکس نہیں سکتے

ہمارے پھول بھی چاہیں تو ہنس نہیں سکے

یہ جوشِ پاک زمانہ دبا نہیں سکتا　　رگوں میں خوں کی حرارت مٹا نہیں سکتا

یہ آگ وہ ہے جو پانی بجھا نہیں سکتا　　دلوں میں آ کے یہ ارمان جا نہیں سکتا

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے

نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

مسز بسنٹ کی خدمت میں قوم کا پیامِ وفا

ہند بیدار ہوا یوں تری بیداری سے　　جیسے برسوں کا مریض اُٹھتا ہے بیماری سے

قوم آزاد ہوئی تیری گرفتاری سے　　چاندنی پھیل گئی حسن وفاداری سے

تو نظر بند ہے جلوہ ہے ترا ہر گھر میں
شمع فانوس میں ہے نور ہے محفل بھر میں

حکم حاکم کا ہے فریاد زبانی رک جائے
دل کی بہتی ہوئی گنگا کی روانی رک جائے

قوم کہتی ہے ہوا بند ہو پانی رک جائے
پر یہ ممکن نہیں اب جوش جوانی رک جائے

ہوں خبردار جنہوں نے یہ اذیت دی ہے
کچھ تماشا یہ نہیں قوم نے کروٹ لی ہے

ہو چکی قوم کے ماتم میں بہت سینہ زنی
اب ہو اس رنگ کا سنیاس یہ ہے دل میں ٹھنی

مادر ہند کی تصویر ہو سینہ پہ بنی
بیڑیاں پاؤں میں ہوں اور گلے میں کفنی

ہو یہ صورت سے عیاں عاشق آزادی ہیں
قفل ہے جن کی زباں پہ یہ وہ فریادی ہیں

آج سے شوق وفا کا یہی جوہر ہو گا
فرش کانٹوں کا ہمیں پھولوں کا بستر ہو گا

پھول ہو جائیگا چھاتی پہ جو پتھر ہو گا
قیدخانہ جسے کہتے ہیں وہی گھر ہو گا

سنتری دیکھ کے اس جوش کو شرمائیں گے
گیت زنجیر کی جھنکار پہ ہم گائیں گے

(جنوبی افریقہ میں شورش ۱۹۱۴ء) فریاد قوم

وطن سے دور تباہی میں ہے وطن کا جہاز
ہوا ہے ظلم کے پردے میں حشر کا آغاز

سنیں تو قوم کے ہمدرد ملک کے دمساز
ہوا کے ساتھ یہ آتی ہے دکھ بھری آواز

وطن سے دور رہیں ہم پہ نگاہ کر لینا
"اِدھر بھی آگ لگی ہے ذرا خبر لینا"

نصیب چین نہیں بھوک پیاس کے مارے ہیں کس عذاب میں ہندوستان کے پیارے
تمہیں تو عیش کے سامان جمع ہیں سارے وہاں بدن سے رواں ہیں لہو کے فوّارے
جو چپ رہیں تو ہوا قوم کی بگڑتی ہے
جو سر اُٹھائیں تو کوڑوں کی مار پڑتی ہے

وطن سے دور بھی ہیں اور خانہ ویراں بھی اسیر یاس بھی ہیں اور اسیر زنداں بھی
تباہ حال ہیں ہندو بھی اور مسلماں بھی ہوئے ہیں نذر مصیبت کے دین و ایماں بھی
پڑھی نماز تو اُجڑے گھروں کے صحرا میں
اگر نہائے تو اپنے لہو کی گنگا میں

جو دب کے بیٹھ رہے سر اُٹھاؤ گے پھر کیا عدوئے قوم کو نیچا دکھاؤ گے پھر کیا
جفا و جور کی ذلّت مٹاؤ گے پھر کیا تم اپنے بچّوں کو قصّے سناؤ گے پھر کیا
رہے گا قول یہی اُن سے اُن کی ماؤں کا
لہو رگوں میں تمہارے ہے بے حیاؤں کا

(لکھنؤ میں ہندو یونیورسٹی کے وفد کی آمد ۱۹۱۱ء) قومی مسدس

یہ کارِ خیر وہ ہو نام چار سو رہ جائے تمہاری بات زمانہ کے روبرو رہ جائے

جو غیر ہیں اُنہیں ہنسنے کی آرزو رہجائے	غریب قوم کی دنیا میں آبرو رہجائے

ذرا حمیت و غیرت کا حق ادا کردو

فقیر قوم کے آئے ہیں جھولیاں بھردو

(۳) سوشل اصلاح

(کشمیری پنڈتوں میں بیوہ کی پہلی شادی ۱۹۱۶ء)

برق اصلاح

بے گنہ ظلم سے ہو جاتے ہیں اکثر معذور	مگر انصاف کا دربار بھی ہوتا ہے ضرور

قوم کے جبر کا لیکن ہے نرالا دستور	یہ ہو پابند جہالت تو ہے دُنیا مجبور

دل تو کیا روح بھی اس قید سے آزاد نہیں

یہ ہے وہ ظلم کہ جس کی کہیں فریاد نہیں

ضعفِ اخلاق سے تھے قوم کے اعضا بیکار	دل کی راحت طلبی سے تھیں اُمنگیں لاچار

بعدِ مدت ہوئے غیرت کے نمایاں آثار	نوکِ نشتر سے ہوا خون رگوں میں بیدار

یوں ہی اصلاح کی تاثیر عیاں ہوتی ہے

قوم پیری میں اسی طرح جواں ہوتی ہے

ہے اِدھر جوش پہ آزاد خیالی کی ترنگ	سر میں سودا ہے دلوں میں ہے جوانی کی اُمنگ

اس طرف بزمِ حریفاں کا ہے اُکھڑا ہوا رنگ	ڈھونڈھتے پھرتے ہیں تفریق کے لئے ہم آہنگ

کوئی باقی نہیں اب ان کے طرفداروں میں

مل گئی ٹوٹ کے توبہ بھی گنہگاروں میں

قوم کی لڑکیوں سے خطاب پھول مالا

روشِ خام پہ مردوں کی نہ جانا ہرگز
داغ تعلیم میں اپنی نہ لگانا ہرگز

نام رکھا ہے نمائش کا ترقی و رفارم
تم اس انداز کے دھوکے میں نہ آنا ہرگز

رنگ ہے جن میں مگر بوئے وفا کچھ بھی نہیں
ایسے پھولوں سے نہ گھر اپنا سجانا ہرگز

خود جو کرتے ہیں زمانہ کی روش کو بدنام
ساتھ دیتا نہیں ایسوں کا زمانہ ہرگز

پھنسنے کے لئے مندر جو ہے آزادی کا
اُس کو تفریح کا مرکز نہ بنانا ہرگز

اپنے بچوں کی خبر قوم کے مردوں کو نہیں
یہ ہیں معصوم انہیں بھول نہ جانا ہرگز

ان کی تعلیم کا مکتب ہے تمہارا زانو
پاس مردوں کے نہیں ان کا ٹھکانا ہرگز

کاغذی پھول ولایت کے دکھا کر ان کو
دیس کے باغ سے نفرت نہ دلانا ہرگز

نغمۂ قوم کی لے جس میں سما ہی نہ سکے
راگ ایسا کوئی ان کو نہ سکھانا ہرگز

گو بزرگوں میں تمہارے نہ ہو اس وقت کا رنگ
ان ضعیفوں کو نہ ہنس ہنس کے رُلانا ہرگز

ہم تمہیں بھول گئے اس کی سزا پاتے ہیں
تم ذرا اپنے تئیں بھول نہ جانا ہرگز
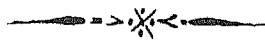
(نوجوانوں سے خطاب) دردِ دل

چمنِ عمر ہمیشہ نہ رہیگا شاداب   خُم میں باقی نہ رہیگی یہ جوانی کی شراب
نشۂ علم میں ہر وقت رہو تم غرقاب   شانِ تعلیم یہی ہے یہی تہذیبِ شباب

لے اُڑے دل کو طبیعت کی روانی وہ ہے
بے پئے نشہ رہے جس میں جوانی وہ ہے

مست کردیتی ہے ایسا یہ شراب سرجوش   نظر آتی ہے مے حُسن سے دُنیا مدہوش
سیرِ جنت میں رہا کرتے ہیں چشم و لب و گوش   مجھ سے کہتا تھا جوانی میں مرا بادہ فروش

ہر گھڑی عالمِ بالا پہ نظر رہتی ہے
کہیں انسان کو دنیا کی خبر رہتی ہے

(۴۷) مناظرِ قدرت

سیرِ دہرہ دون

فضائے کوہ میں ایسی ہوا سماتی ہے   بشر کی روح کو راحت کی نیند آتی ہے
بس ایک عالمِ ہُو چار سمت طاری ہے   نہ شور و شر ہے نہ دنیا کی آہ و زاری ہے
اثر دکھاتا ہے قدرت کا نغمۂ دلگیر   شجر حجر سے ٹپکتی ہے راگ کی تاثیر
یہ راگ وہ ہے جو مضراب کا اسیر نہیں   یہ حرف کان کے پردوں میں گوشہ گیر نہیں

وہی سُنے گا اسے۔ دل گداز ہے جس کا
ہو دل میں سوز تو رگ رگ میں ساز ہے آں کا

یہ راگ مجھ میں سمایا سرور بن کے ہو کر
ہوس تھی روح کو مل جائے اس میں بے ہو کر

حریم خاص میں قدرت کے باریابی تھی
نگاہِ شوق میں اک شان بے حجابی تھی

نشست سنگ پہ تھی سایۂ شجر کے تلے
رواں تھا چشمۂ آبِ خنک نظر کے تلے

شریکِ حال تھی وضعِ قدیم قدرت کی
عیاں تھی سنگ و شجر سے کشش محبت کی

شرابِ اُنس حقیقی سے تھا ہر اک سرشار
شجر تھا کوہ تھا چشمہ تھا یا یہ مشتِ غبار

درخت و کوہ ہیں کیا ذاتِ پاکِ انساں کیا
طیور کیا ہیں ہوا کیا ہے ابر باراں کیا

یہ موجِ ہستیِ بیدار کے عناصر ہیں
سب ایک قافلۂ شوق کے مسافر ہیں

یہ دل کے ٹکڑے ہیں قدرت کے ان میں بیر نہیں
سب ایک گود کے پالے ہیں کوئی غیر نہیں

انہیں سے نغمۂ قدرت ہے اوج و پستی میں
سب ایک ساز کے پردے ہیں بزمِ ہستی میں

جدا کسی سے بھی ہستی کا اپنے راز نہیں
کچھ آبشار میں اور ہم میں امتیاز نہیں

ہے جسم خاک یہاں اس کا جسم پانی ہے
جو روح ہم میں ہے اُس میں وہی روانی ہے

پھول

یا باغ میں کھلتا ہے دمِ صبح گُلِ تر
کیا کیا اسے ہوتے نہیں اعزاز میسّر

بنتا ہے عروسانِ جہاں کے لئے زیور
دستار میں نوشہ کے رہا کرتا ہے اکثر

لیکن نہ کسی وضع پہ اس ڈھنگ سے دیکھا
بیکس کی لحد پر اسے جس رنگ سے دیکھا

(۵) فلسفۂ حیات

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب　　موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

x

فنا کا ہوش آنا زندگی کا دردِ سر جانا　　اجل کیا ہے خمارِ بادۂ ہستی اُتر جانا

x

آبرو کیا ہے تمنائے وفا میں مرنا　　دین کیا ہے کسی کامل کی پرستش کرنا

x

اگر دردِ محبت سے نہ انساں آشنا ہوتا　　نہ مرنے کا الم ہوتا نہ جینے کا مزا ہوتا

x

دردِ اُلفت آدمی کے واسطے اکسیر ہے　　خاک کے پُتلے اسی جوہر سے انساں ہو گئے

x

کمالِ بزدلی ہے پست ہونا اپنی آنکھوں میں　　اگر تھوڑی سی ہمّت ہو تو پھر کیا ہو نہیں سکتا
اُبھرنے ہی نہیں دیتی ہیں بے مائگی دل کی　　نہیں تو کون قطرہ ہے جو دریا ہو نہیں سکتا

محبت ہے مجھے کوئل کے دردانگیز نالوں سے چمن میں جا کے میں پھولوں کا شیدا ہو نہیں سکتا

---x---

نئی تہذیب کے صدقے نہ شرمانے دیا دل کو رہے منطق کے پردہ میں کرشمے بے حیائی کے

---x---

ہوس جینے کی ہے یوں عمر کے بیکار کٹنے میں جو ہم سے زندگی کا حق ادا ہوتا تو کیا ہوتا

---x---

اہلِ ہمت منزلِ مقصود تک آ بھی گئے بندۂ تقدیر قسمت سے گلا کرتے رہے

---x---

وہ سودا زندگی کا ہے کہ غم انسان سہتا ہے نہیں تو ہے بہت آسان اس جینے سے مر جانا

---x---

جہاں میں رہ کے یوں قائم ہوں اپنی بے ثباتی پر کہ جیسے عکسِ گل رہتا ہے آبِ جوئے گلشن میں

---x---

کشاکش ہے اُمید و یاس کی یہ زندگی کیا ہے الٰہی ایسی ہستی سے تو اچھا تھا عدم میرا

---x---

اگر کون و مکاں اک شعبدہ تھا تیری قدرت کا تو اس دُنیا میں آخر کس لئے آیا قدم میرا

---x---

خود پرستی گھٹ گئی قدرِ محبت بڑھ گئی
ماتمِ احباب ہے تعلیمِ روحانی مجھے

ہائے اس دنیا کی پابندی عجب دلگیر ہے
خود پہنتا ہے جسے انساں یہ وہ زنجیر ہے

دیکھا سرورِ بادۂ ہستی کا خاتمہ
اب دیکھیں رنگ لائے اجل کا خمار کیا

رنج و راحت کا سبب دنیا میں کچھ پایا نہیں
حشر میں ہم صاف کہہ دینگے خدا کے سامنے

مزا شباب میں ہے سر سے خوں بہانے کا
لہو میں پھر یہ روانی رہے رہے نہ رہے

اعمال کا طلسم ہے نیرنگِ زندگی
تقدیر کیا ہے گردشِ لیل و نہار کیا

چلتی ہے اس چمن میں ہوا انقلاب کی
شبنم کو آئے دامنِ گل میں قرار کیا

کچھ گل نہاں ہیں پردۂ خاکِ چمن میں بھی
تازہ کریگی اُن کو ہوائے بہار کیا

بلائے جاں ہیں یہ تسبیح اور زنار کے پھندے
دلِ حق بیں کو ہم اس قید سے آزاد کرتے ہیں

اذاں دیتے ہیں بت خانہ میں جا کر شانِ مومن سے
حرم میں نعرۂ ناقوس ہم ایجاد کرتے ہیں

قوم کی شیرازہ بندی کا گلہ بیکار ہے　　رنگِ ہندو دیکھ کر طرزِ مسلماں دیکھ کر

x

دل میں اس طرح سے ارمان ہیں آزادی کے　　جیسے گنگا میں جھلکتی ہے چمک تاروں کی

x

مرے احباب پیش آتے ہیں مجھ سے بیوفائی سے　　وفاداری میں شاید کر رہے ہیں امتحاں میرا

x

دوست مرنے پہ مرے دادِ وفا دیتے ہیں　　ہائے کس وقت محبّت کا صلہ دیتے ہیں
دشمنوں سے بھی مجھے ترکِ وفا مشکل ہے　　دوست بن کر مجھے کمبخت دغا دیتے ہیں

x

جس نے دل پیدا کیا اُس سے شکایت کچھ نہیں　　دل سے جو پیدا ہوئی وہ آرزو بدنام ہے

x

ہمارے اور واعظوں کے مذہب میں فرق اگر ہے تو اس قدر ہے
کہیں گے ہم جس کو پاسِ انساں وہ اُس کو خوفِ خدا کہیں گے

(۶) مراثی
مسٹر گوکھلے

رہا مزاج میں سودائے قوم خو ہو کر　　وطن کا عشق رہا دل کی آرزو ہو کر

بدن میں جان رہی وقفِ آبرو ہو کر رگوں میں جوش محبت رہا لہو ہو کر

خدا کے حکم سے جب آب و گل بنا تیرا

کسی شہید کی مٹی سے دل بنا تیرا

اجل کے دام میں آنا ہے یوں تو عالم کو مگر یہ دل نہیں تیار تیرے ماتم کو

پہاڑ کٹتے ہیں دنیا میں ایسے ہی غم کو مٹا کے تجھ کو اجل نے مٹا دیا ہم کو

جنازہ ہند کا در سے ترے نکلتا ہے

سہاگ قوم کا تیری چتا پہ جلتا ہے

بابو گنگا پرشاد ورما

پیڑ سر سبز ہیں تھالوں میں رواں آب بھی ہے ڈوبتی کرنوں سے فواروں میں اک تاب بھی ہے

گلِ نوخیز بھی ہیں سبزۂ شاداب بھی ہے شام کا وقت بھی ہے مجمعِ احباب بھی ہے

تو کہاں ہے کہ جو اس باغ کا شیدائی ہے

تجھ سے ملنے کے لئے فصلِ بہار آئی ہے

جب زمانہ میں ترے اوج کی نوبت آئی زندگی ختم ہوئی موت کی ساعت آئی

کام کچھ بھی نہ جوانی کی ریاضت آئی صبح پیری نہیں آئی کہ قیامت آئی

روشنی جس کی تھی ہر سو وہ ستارہ ڈوبا

مٹ گئی شام اودھ قوم کا تارا ڈوبا

یوں تو دُنیا میں ہمیشہ سے ہے مرنے کا چلن　　　اپنے بچوں کو نگلتی ہے زمیں کی ناگن

داغ دیتا ہے مگر جب کوئی دل سوزِ وطن　　　اس کے صدمے سے لرزتا ہے یہ ایوانِ کہن

چاندنی رات میں جس وقت ہوا آتی ہے

قوم کے دل کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے

گاندھی

دیکھیے جنگل میں کوئی شام کو تیری رفتار　　　بے پئے جیسے کسی کو ہو جوانی کا خمار

مست کر دیتی ہے شاید تجھے قدرت کی بہار　　　وہ اُترتی ہوئی دھوپ اور وہ سبزے کا نکھار

ایک اک گام پہ شوخی سے مچلنا تیرا

کھا کے جنگل کی ہوا جھوم کے چلنا تیرا

صاحبِ دل تجھے تصویرِ وفا کہتے ہیں　　　چشمۂ فیض خدا مردِ خدا کہتے ہیں

دردمندوں کی مسیحا شعرا کہتے ہیں　　　ہاں تجھے کہتے ہیں ہندو تو بجا کہتے ہیں

کون ہے جس نے ترے دودھ سے منہ پھیرا ہے

آج اس قوم کی رگ رگ میں لہو تیرا ہے

میں اس دیباچہ کو قریب قریب ختم کر چکا تھا کہ دفعتاً اپنے دوست کی ناگہانی وفات کی مجھے خبر ملی۔ اِس کا مجھے بڑا قلق ہے کہ میں اس دیباچہ کو اُن کی زندگی میں نہ ختم کر سکا۔ میرے ایسے اُن سب اصحاب کے لئے جن کو اُن سے

عزیزانہ خلوص و تعلقات کا شرف حاصل تھا ۴۴ برس کی عمر میں ان کی جوانمرگی بلا مبالغہ ایک جانکاہ واقعہ ہے ان کی جگہ ان کے دوستوں کے حلقہ میں خالی ہوگئی ہے اس سے جو اُن کے احباب کے دل پر گذرتا ہے وہ سوا اُن کے اور کوئی محسوس نہیں کرسکتا۔ اور اس کا بھی اندازہ کرنا مشکل ہے کہ اُردو زبان اور اُردو شاعری کو خاص کر ان کی وفات سے کس قدر نقصان پہنچا۔ کس قدر خیالات کی پاکیزگی اور ستودہ صفاتی اور کیسی زبردست ہمدردی انسانی ان کے ساتھ فنا ہوگئی یا مادرِ ہند کی خدمت کرنے کی کیا کیا اُمیدیں خاک میں مل گئیں یہ ایسے سوال ہیں جن پر میں ان کے اور دوستوں کی طرح دمِ تجوداً فسوس کرسکتا ہوں لیکن جواب دینے کی ہمت نہیں رکھتا۔

الہ آباد

۱۴ار فروری ۱۹۲۶ء } تیج بہادر سپرو

نذرانۂ روح

(پنڈت بشن نرائن درمرحوم)

دلِ پُر درد کے ٹکڑے جو کٹے ہیں یکجا
تیرے قدموں کے لئے تھا یہی میرا تحفا

مگر افسوس کہ یہ دین ادا ہو نہ سکا
اب سرِ لوح پہ ہے نقش یہ پیغامِ وفا

میرے سودائے طبیعت کا جو افسانہ ہے

مرنے والے یہ تری روح کا نذرانہ ہے

تیرا بندہ ہے دل سے یہی پیمان رہا
طائرِ فکر ترے اَوج سے حیران رہا

قدر کرنا تری سیکھیں یہی ارمان رہا
یہی مسلک یہی مذہب یہی ایمان رہا

آبرو کیا ہے تمنّائے وفا میں مرنا

دین کیا ہے کسی کامل کی پرستش کرنا

اب پرستش کو ہے باقی تری ہستی کی مثال — دل کے مندر کا اُجالا ہے یہ تصویر کمال
گو کہ یہ روح کا سودا ہے بلا خوف زوال — مگر اس خاک کے پتلے کی ہے تسکین محال

یاد رہتی نہیں تیری درِ حسرت وا ہے
ہم کو معلوم ہوا آج یتیمی کیا ہے

مجھ سے یارانِ عدم نے یہ اگر فرمایا — حسرت آباد جہاں سے تجھے کیا ہاتھ آیا
میں کہوں گا کہ بس اک رہبرِ کامل پایا — زندگی کی یہی دولت ہے یہی سرمایا

لیکے دُنیا سے یہی مہر و فا آیا ہوں
اپنے مُحسن کی غلامی کی سند لایا ہوں

دل یہ کہتا ہے کہ جینے کی لطافت نہیں خاک — خود بخود جان ہوئی جاتی ہے سینہ میں ہلاک
یہ مگر شرط وفا ہے نہ ہوں آنکھیں نمناک — چڑھ کے غیروں کی نظر پہ نہ ہوں آنسو ناپاک

جس کی دُنیا کو خبر ہو یہ وہ ناسور نہیں
تیرے ماتم کی نمائش مجھے منظور نہیں

چکبست لکھنوی

حِصّۂ اوّل

خاکِ ہند

۱۹۰۵ء

اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے　　دریائے فیض قدرت تیرے لئے رواں ہے
تیری جبیں سے نورِ حُسنِ ازل عیاں ہے　　اللہ رے زیب و زینت کیا اوج عزّ و شاں ہے

ہر صبح ہے یہ خدمت خورشیدِ پُرضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیا کی

اِس خاکِ دلنشیں سے چشمے ہوئے وہ جاری　　چین و عرب میں جن سے ہوتی تھی آبیاری
سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا ابر طاری　　چشم و چراغِ عالم تھی سرزمیں ہماری

شمع ادب نہ تھی جب یوناں کی انجمن میں
تاباں تھا مہرِ دانش اس وادیِ کہن میں

گوتم نے آبرو دی اِس معبدِ کُہن کو　　سرمد نے اِس زمیں پر صدقے کیا وطن کو
اکبر نے جامِ اُلفت بخشا اِس انجمن کو　　سینچا لہو سے اپنے رانا[۱] نے اس چمن کو

سب سور بیر اپنے اس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا اُن کی ہڈیاں ہیں

---

[۱] رانا پرتاب فرماں روائے اودے پور۔

دیوار و در سے اب تک ان کا اثر عیاں ہے　　اپنی رگوں میں اب تک اُن کا لہو رواں ہے

اب تک اثر میں ڈوبی ناقوس کی فغاں ہے　　فردوس گوش اب تک کیفیتِ اذاں ہے

کشمیر سے عیاں ہے جنّت کا رنگ اب تک

شوکت سے بہ رہا ہے دریائے گنگ اب تک

اگلی سی تازگی ہے پھولوں میں اور پھلوں میں　　کرتے ہیں رقص اب تک طاؤس جنگلوں میں

اب تک وہی کڑک ہے بجلی کی بادلوں میں　　پستی سی آگئی ہے پر دل کے حوصلوں میں

گُل شمع انجمن ہے گو انجمن وہی ہے

حُبِّ وطن نہیں ہے خاکِ وطن وہی ہے

برسوں سے ہو رہا ہے برہم سماں ہمارا　　دُنیا سے مٹ رہا ہے نام و نشاں ہمارا

کچھ کم نہیں اجل سے خوابِ گراں ہمارا　　اک لاش بے کفن ہے ہندوستاں ہمارا

علم و کمال و ایماں برباد ہو رہے ہیں

عیش و طرب کے بندے غفلت میں سو رہے ہیں

اے صورِ حُبِّ قومی اس خواب سے جگا دے　　بھولا ہوا فسانہ کانوں کو پھر سنا دے

مُردہ طبیعتوں کی افسردگی مٹا دے　　اُٹھتے ہوئے شرارے اِس راکھ سے دکھا دے

حُبِّ وطن سمائے آنکھوں میں نور ہو کر

سر میں خمار ہو کر دل میں سرور ہو کر

شیدائے بوستاں کو سرو و سمن مبارک　رنگیں طبیعتوں کو رنگِ سخن مبارک
بلبل کو گل مبارک گل کو چمن مبارک　ہم بیکسوں کو اپنا پیارا وطن مبارک
غنچے ہمارے دل کے اِس باغ میں کھلیں گے
اِس خاک سے اُٹھے ہیں اِس خاک میں ملیں گے

ہے جوئے شیر ہم کو نورِ سحر وطن کا　آنکھوں کی روشنی ہے جلوہ اِس انجمن کا
ہے رشکِ مہر ذرّہ اِس منزلِ کہن کا　تُلتا ہے برگِ گل سے کانٹا بھی اِس چمن کا
گرد و غبار یاں کا خلعت ہے اپنے تن کو
مر کر بھی چاہتے ہیں خاکِ وطن کفن کو

وطن کا راگ

۱۹۱۷ء

زمین ہند کی رُتبہ میں عرش اعلیٰ ہے　یہ ہوم رول کی اُمید کا اُجالا ہے
مسز بسنٹ نے اِس آرزو کو پالا ہے　فقیر قوم کے ہیں اور یہ راگ مالا ہے
طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

وطن پرست شہیدوں کی خاک لائیں گے — ہم اپنی آنکھ کا سُرمہ اُسے بنائیں گے
غریب ماں کے لئے درد دُکھ اُٹھائیں گے — یہی پیامِ وفا قوم کو سُنائیں گے

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

ہمارے واسطے زنجیر و طوق گہنا ہے — وفا کے شوق میں گاندھی نے جس کو پہنا ہے
سمجھ لیا کہ ہمیں رنج و درد سہنا ہے — مگر زباں سے کہیں گے وہی جو کہنا ہے

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

پنھانے والے اگر بیڑیاں پنھائیں گے — خوشی سے قید کے گوشہ کو ہم بسائیں گے
جو سنتری درِ زنداں کے سو بھی جائیں گے — یہ راگ گا کے اُنھیں نیند سے جگائیں گے

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

زباں کو بند کیا ہے یہ غافلوں کو ہے ناز — ذرا رگوں میں لہو کا بھی دیکھ لیں انداز
رہے گا جان کے ہمراہ دِل کا سوز و گداز — چتا سے آئے گی مرنے کے بعد یہ آواز

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

یہی دُعا ہے وطن کے شکستہ حالوں کی یہی اُمنگ جوانی کے نو نہالوں کی
جو رہنما ہے محبت پہ مٹنے والوں کی ہمیں قسم ہے اُسی کے سپید بالوں کی

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

یہی پیام ہے کوئل کا باغ کے اندر اِسی ہوا میں ہے گنگا کا زور آٹھ پہر
ہلالِ عید نے دی ہے یہی دلوں کو خبر پکارتا ہے ہمالہ سے ابر اُٹھ اُٹھ کر

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

بسے ہوئے ہیں محبت سے جن کی قوم کے گھر وطن کا پاس ہے اُن کو سُہاگ سے بڑھ کر
جو شیر خوار ہیں ہندوستاں کے لختِ جگر یہ ماں کے دودھ سے لکھا ہے اُنکے سینے پر

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے
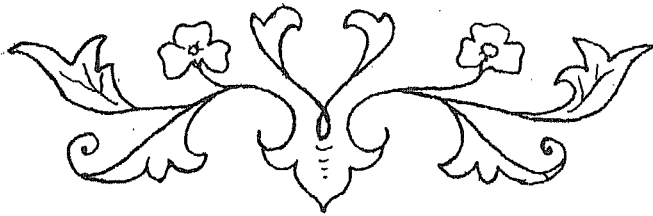
آوازۂ قوم

سنہ ۱۹۱۶ء

یہ خاکِ ہند سے پیدا ہیں جوش کے آثار ہمالیہ سے اُٹھے جیسے ابرِ دریا بار
لہو رگوں میں دکھاتا ہے برق کی رفتار ہوئی ہیں خاک کے پردہ میں ہڈیاں بیدار
زمیں سے عرش تلک شور ہوم رول کا ہے
شبابِ قوم کا ہے زور ہوم رول کا ہے

نگاہِ شوق ہے اس رنگ کی تماشائی ہے جس سے شیخ و برہمن پہ بیخودی چھائی
ہر ایک گام پہ کرتے ہوئے جبیں سائی چلے ہیں بہرِ زیارت وفا کے سودائی
وطن کے عشق کا بُت بے نقاب نکلا ہے
نئے اُفق پہ نیا آفتاب نکلا ہے

یہ آرزو ہے کہ مہر و وفا سے کام رہے
وطن کے باغ میں اپنا ہی انتظام رہے
گلوں کی فکر میں گلچیں نہ صبح و شام رہے
نہ کوئی مُرغ خوش الحان اسیرِ دام رہے

سریر شاہ کا اقبال ہو بہارِ چمن
رہے چمن کا محافظ یہ تاجدارِ چمن

ہے آج کل کی ہوا میں وفا کی بربادی
سُنے جو کوئی تو سارا چمن ہے فریادی
قفس میں بند ہیں جو آشیاں کے تھے عادی
اُڑا ہے باغ سے بُو ہو کے رنگت آزادی

ہوائے شوق میں غنچے بِکَس نہیں سکتے
ہمارے پھول بھی چاہیں تو ہنس نہیں سکتے

جو آج کل ہے محبت وطن کی عالمگیر
یہی گنہ ہے یہی جُرم ہے یہی تقصیر
زباں ہے بند قلم کو پنھائی ہے زنجیر
بیانِ درد کی باقی نہیں کوئی تدبیر

ہے دل میں درد مگر طاقت کلام نہیں
لگے ہیں زخم تڑپنے کا انتظام نہیں

جو اپنے حال پہ یہ بیکسی برستی ہے
یہ نائبانِ حکومت کی خود پرستی ہے
یہاں سے دُور جو برطانیہ کی بستی ہے
وہاں سُنا ہے محبت کی جنس سستی ہے

جو اُس پہ حالِ وطن آشکار ہو جائے
یہ دیکھتے رہیں بیڑا یہ پار ہو جائے

فدائیان حکومت نے ہم کو رنج دیئے — مگر جو فرض وفا تھے ادا وہ ہم نے کیئے
نثار جاں سے ہوئے واب سلطنت کے لئے — شراب عیش سمجھ کر لہو کے گھونٹ پیئے

ڈگے نہ پانوں محبت کے نوک خنجر پر
لہو کی مُہر ہے اپنی وفا کے محضر پر

جو اپنے دل سے ہے برطانیہ کا دل راضی — تو کیا کریں گے یہ ہندوستان کے قاضی
نہ کام آئے گی غیروں کی رخنہ اندازی — تُمھیں پکار رہی ہے سخی کی فیاضی

بچی کُھچی پہ قناعت ہے یوں نہیں پیتے
پلانے والا پلاتا ہے کیوں نہیں پیتے

رہا ہے رات کی صحبت میں کیا مزا باقی — نگاہِ شوق کو ہے دورِ نَو کی مشتاقی
نئی شراب نیا دور اور نیا ساقی — مٹے سرور میں دیر و حرم کی ناچاقی

یہی کسی کا حرم ہو کسی کا دیر رہے
یہ میکدہ رہے آباد خُم کی خیر رہے

شراب شوق دوا ہے اِس انجمن کے لئے — سرور اس کا ہے اکسیر روح و تن کے لئے
کھنچی ہے خُلد میں اِس محفلِ کُہن کے لئے — فلک سے اُتری ہے یہ شیخ و برہمن کے لئے

رہے گا دورِ زمانہ میں یادگار اس کا
یہ ہوم رول کا سودا خُمار ہے اس کا

اسی کے مست کہیں ہیں حرم پہ چھائے ہوئے اذاں کے نعرۂ دلکش سے حظ اُٹھائے ہوئے

کہیں ہے نغمۂ ناقوس دل لُبھائے ہوئے اِسی فضا میں یہ سب راگ ہیں سمائے ہوئے

یہ حکم پیر مغاں کا ہے نشۂ مے میں

یہ راگ آکے ملیں ہوم رول کی لے میں

رقیب کہتے ہیں رنگِ وطن نہیں یکساں بنا ہے قوس قزح خاک ہند کا داماں

جدھر نگاہ اُٹھے اس طرف نیا ہے سماں نہ ایک رنگ طبیعت نہ ایک رنگ زباں

جو ہوم رول پہ یہ چشم شوق شیدا ہو

تمام رنگ ملیں ایک نُور پیدا ہو

جو دل سے قوم کے نکلی ہے وہ دُعا ہے یہی تھا جس پہ ناز مسیحا کو وہ صدا ہے یہی

دلوں کو مست جو کرتی ہے وہ ہوا ہے یہی غریب ہند کے آزار کی دوا ہے یہی

نہ چین آئے گا بے ہوم رول پائے ہوئے

فقیر قوم کے بیٹھے ہیں لَو لگائے ہوئے

یہ جوشِ پاک زمانہ دبا نہیں سکتا رگوں میں خوں کی حرارت مٹا نہیں سکتا

یہ آگ وہ ہے جو پانی بجھا نہیں سکتا دلوں میں آکے یہ ارمان جا نہیں سکتا

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے

نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

مسزؔ بسنٹ کی خدمت میں قوم کا پیامِ وفا

سنہ ۱۹۱۷ء

قوم غافل نہیں ماتا تری غمخواری سے
زلزلہ مُلک میں ہے تیری گرفتاری سے

آگ بھڑکی ہے تری آہ کی چنگاری سے
خاک حاصل نہ ہوا تیری دل آزاری سے

دل ترا قوم کے دامن میں دیئے جاتے ہیں
ہڈیوں کو تری زنداں میں لئے جاتے ہیں

لہلہاتا ہے محبت کا تری دل میں چمن
ماں کے دامن سے ہے بڑھ کر ہمیں تیرا دامن

تیری تصویر سے ہیں قوم کی آنکھیں روشن
تیرے بالوں کی سپیدی ہے کہ ہے صبح وطن

دلِ پُر درد کی تصویر ہے صورت تیری
تاج کانٹوں کا ہے پہنے ہوئے مورت تیری

داستاں دین کی دُنیا کو سُنائی تو نے
مذہبی بَیر کی بُنیاد مٹائی تو نے

آگ بھڑکی ہوئی صدیوں کی بُجھائی تو نے
راہ انصاف کی اندھوں کو دکھائی تو نے

کس نے گرتی ہوئی قوموں کو سنبھالا ہوتا
تو نہ ہوتی تو نہ دُنیا میں اُجالا ہوتا

ف یہ نظم مسز بسنٹ کی نظر بندی کے زمانہ میں لکھی گئی ہے۔

ہند بیدار ہوا یوں تیری بیداری سے
جیسے برسوں کا مریض اُٹھتا ہے بیماری سے
قوم آزاد ہوئی تیری گرفتاری سے
چاندنی پھیل گئی حُسنِ وفاداری سے

تو نظر بند ہے جلوہ ہے ترا ہر گھر میں
شمع فانوس میں ہے نُور ہے محفل بھر میں

پھول پتّے ہیں ترے رنگ وفا سے آباد
دردمندوں کی طرح کرتے ہیں پتّھر فریاد
بیوفاؤں کی ہوئی جاتی ہے کوشش برباد
تو گرفتار سہی ہے تری شکتی آزاد

راحتِ جسم کا در بند رہے یا نہ رہے
ڈھیر مٹّی کا نظر بند رہے یا نہ رہے

تو نے پودا جو لگایا تھا وہ پھل لایا ہے
آبرو قوم نے پائی ہے وہ دن آیا ہے
ہم نے بھولے ہوئے ورثہ کا نشاں پایا ہے
مرنے والوں کی وفا کا یہی سرمایا ہے

دل تڑپتا ہے کہ سوراج کا پیغام مِلے
کل مِلے آج مِلے صبح مِلے شام مِلے

حکم حاکم کا ہے فریاد زبانی رُک جائے
دل کی بہتی ہوئی گنگا کی روانی رُک جائے
قوم کہتی ہے ہَوا بند ہو پانی رُک جائے
پر یہ ممکن نہیں اب جوشِ جوانی رُک جائے

ہوں خبردار جنھوں نے یہ اذیت دی ہے
کچھ تماشا یہ نہیں قوم نے کروٹ لی ہے

ہو چکی قوم کے ماتم میں بہت سینہ زنی　　اب ہوا اس رنگ کا سنیاس سے دل میں ٹھنی
مادرِ ہند کی تصویر ہو سینے پہ بنی　　بیڑیاں پیر میں ہوں اور گلے میں کفنی

ہو یہ صورت سے عیاں عاشقِ آزادی ہیں
قفل ہے جن کی زباں پر یہ وہ فریادی ہیں

آج سے شوق وفا کا یہی جوہر ہو گا　　فرش کانٹوں کا ہمیں پھولوں کا بستر ہو گا
پھول ہو جائے گا چھاتی پہ جو پتھر ہو گا　　قید خانہ جسے کہتے ہیں وہی گھر ہو گا

سنتری دیکھ کے اس جوش کو شرمائیں گے
گیت زنجیر کی جھنکار پہ ہم گائیں گے

جن کا دامان وفا قوم کا گہوارا ہے　　اُن کو عصمت کی طرح پاسِ وطن پیارا ہے
اِن کی فریاد سے زخمی دلِ صد پارہ ہے　　چشمِ معصوم کا آنسو نہیں انگارا ہے

ستّ جسے کہتے ہیں وہ اُنس ہے دم سازان کی
پردۂ غیب کی آواز ہے آواز اِن کی

جس میں سودائے محبت تھا وہ سر باقی ہے　　رات اندھیری ہے مگر یادِ سحر باقی ہے
دل کے ہر زخم میں فریاد کا در باقی ہے　　قوم بیدار کے سینے میں جگر باقی ہے

دل دہلتے نہیں زنداں میں گرفتاروں کے
بیڑیاں ڈھونڈھتے ہیں پاؤں وفاداروں کے

جوشِ سودائے محبت میں پڑے گر اُفتاد | دلِ سرمست کہے خانۂ احساں آباد
بے زباں کرتے ہیں شاعر کی زباں سے فریاد | یہ زباں وہ ہے جو زنداں میں ہے گی آزاد

پاک ہے جوشِ سخن خوف کی تدبیروں سے
ولولے روح کے آزاد ہیں زنجیروں سے

فریادِ قوم

سنہ ۱۹۱۴ء

ہے آج اور ہی کچھ صورتِ بیاں میری | تڑپ رہی ہے دہن میں مرے زباں میری
چھدیں گے قلب و جگر تیر ہے فغاں میری | لہو کے رنگ میں ڈوبی ہے داستاں میری

مبالغہ نہیں تمہید شاعرانہ نہیں
غریب قوم کا ہے مرثیہ فسانہ نہیں

ع یہ نظم اُس زمانہ میں تصنیف کی گئی ہے جب کہ دور اُفتادگان وطن جنوبی افریقہ میں ٹرینسوال کے حکام کی غیر منصفانہ کارروائیوں سے عاجز تھے اور مہاتما کرم چند گاندھی ان غریب الوطنوں کی حالت درست کرنے کی کوشش میں دل و جان سے مصروف تھے۔ یہ نظم ایک رسالہ کی صورت میں شائع کی گئی تھی اور مہاتما گاندھی کا نام بہ صورت ذیل زیب عنوان کیا گیا تھا۔

بخدمت فدائے قوم مسٹر کرم چند گاندھی

نثار ہے دلِ شاعر ترے قرینے پر
کیا ہے نام ترا نقش اس نگینے پر

چکبست لکھنوی

وطن سے دُور تباہی میں ہے وطن کا جہاز — ہُوا ہے ظلم کے پردے میں حشر کا آغاز
سنیں تو مُلک کے ہمدردِ قوم کے دمساز — ہَوا کے ساتھ یہ آتی ہے دُکھ بھری آواز

وطن سے دُور ہیں ہم پر نگاہ کر لینا
اِدھر بھی آگ لگی ہے ذرا خبر لینا

جو مست رہے ہیں وطن پر یہ ہے صدا اُن کی — لہو پکار رہا ہے یہ ہے وفا اُن کی
ہندھی ہے عالمِ تہذیب میں ہوا اُن کی — غضب کی جا ہے جو گردن جُھکے ذرا اُن کی

تمھارے دل میں نہ اُلفت کی ہُوک اُٹھے افسوس
وطن کا قافلہ پردیس میں لُٹے افسوس

ٹرینسوال کے حاکم وفا شعار نہیں — کچھ ان کے قول کا دُنیا میں اعتبار نہیں
ہماری قوم پہ احساں کا اُن کے بار نہیں — یہ ظلم کیوں ہے ہم اُن کے گنہگار نہیں

اگر وہ دولتِ برطانیہ کے پیارے ہیں
تو اہلِ ہند اُسی آسماں کے تارے ہیں

مگر جفا سے نہیں ظالموں کو مطلق عار — اُجاڑتے ہیں وہ بستی جو تھی کبھی گلزار
جہاں خوشی کے ترانوں کا گرم تھا بازار — سُنائی دیتی ہے واں بیڑیوں کی اَب جھنکار

کیا ہے بند مسافر سمجھ کے راہوں کو
پنھائی جاتی ہے زنجیر بے گُناہوں کو

لُٹے ہیں یُوں کہ کسی کی گرہ میں دام نہیں — نصیب رات کو پڑ رہنے کا مقام نہیں
یتیم بچّوں کے کھانے کا انتظام نہیں — جو صبح خیر سے گذُری اُمیدِ شام نہیں

اگر جئے بھی تو کپڑا نہیں بدن کے لئے
مَرے تو لاش پڑی رہ گئی کفن کے لئے

نصیب چین نہیں بھوک پیاس کے مارے — ہیں کس عذاب میں ہندوستان کے پیارے
تمھیں تو عیش کے سامان جمع ہیں سارے — وہاں بدن سے رواں ہیں لہو کے فوّارے

جو چُپ رہیں تو ہَوا قوم کی بگڑتی ہے
جو سر اُٹھائیں تو کوڑوں کی مار پڑتی ہے

وطن سے دُور بھی ہیں اور خانہ ویراں بھی — اسیرِ یاس بھی ہیں اور اسیرِ زنداں بھی
تباہ حال ہیں ہندو بھی اور مُسلماں بھی — ہوئے ہیں نذرِ مصیبت کے دین و ایماں بھی

پڑھی نماز تو اُجڑے گھروں کے صحرا میں
اگر نہائے تو اپنے لہو کے گنگا میں

اگر دلوں میں نہیں اب بھی جوشِ غیرت کا — تو پڑھ دو فاتحہ قومی وقار و عزّت کا
وفا کو پھونک دو ماتم کرو محبت کا — جنازہ لے کے چلو قوم و دین و مِلّت کا

نشاں مِٹا دو اُمنگوں کا اور ارادوں کا
لہو میں غرق سفینہ کرو مُرادوں کا

کہاں ہیں مُلک کے سرتاج قوم کے سردار　　پُکارتے ہیں مدد کے لئے درو دیوار
وطن کی خاک سے پیدا ہیں جوش کے آثار　　زمین ہلتی ہے اُڑتا ہے خون بن کے غبار

جگہ سے اپنی ہے چتّوڑ کی زمیں سرکی
لرز رہی ہے کئی دن سے قبر اکبر کی

بھنور میں قوم کا بیڑا ہے ہندوؤ ہُشیار　　اندھیری رات ہے کالی گھٹا ہے اونچھدہار
اگر پڑے رہے غفلت کی نیند میں سرشار　　تو زیرِ موج فنا ہو گا آبرو کا مزار

مِٹے گی قوم یہ بیڑا تمام ڈوبے گا
جہاں میں بھیشم و ارجن کا نام ڈوبے گا

جنھیں رُلائے نہ اب بھی یہ قوم کی اُفتاد　　سیاہ قلب وہ ہندو ہیں کنس کی اولاد
مگر وہ کیا ہیں کسی کی بھی گر نہ ہو امداد　　اثر دکھائے گی جادو کا قوم کی فریاد

اُٹھیں گے خاک کے تودے سے دستگیر اپنے
زمین ہند کی اُگلے گی سورمیرا اپنے

۷　دکھا دو جوہرِ اسلام اے مُسلمانو!　　وقارِ قوم گیا قوم کے نگہبانو
ستون مُلک کے ہو قدر قومیت جانو　　جفا وطن پہ ہے فرضِ وفا کو پہچانو

نبی کے خُلق و مروّت کے ورثہ دار ہو تُم
عرب کی شانِ حمیّت کے یادگار ہو تُم

کرو خیال کچھ اسلاف کی حمیت کا دیا تھا دشمنِ قاتل کو جام شربت کا
معاملہ ہے یہاں بھائیوں کی عزت کا یہ فرض عین ہے سودا نہیں مروت کا

اگر نہ اب بھی ہوا اسلام کا جگر پانی
ہزار خندۂ کفر است بر مسلمانی

اگر نہ قوم کے اس وقت بھی تم آئے کام نصیب ہوگا نہ مرنے پہ بھی تمھیں آرام
یہی کہے گا زمانہ کہ تھا برائے نام وہ دھرم ہندوؤں کا وہ حمیتِ اسلام

ذرا اثر نہ ہوا قوم کے جیبوں پر
وطن سے دور چھری چل گئی غریبوں پر

رہے گا مال نہ ہمراہ جائے گی دولت گئی تو قبر تلک ساتھ جائے گی ذلت
کرو جو ایک روپے سے بھی قوم کی خدمت تمھاری ذات سے ہو اک یتیم کو راحت

ملے حجاب کی چادر کسی کی عصمت کو
کفن نصیب ہو شاید کسی کی میت کو

جو دب کے بیٹھ رہے سر اٹھاؤ گے پھر کیا عدوئے قوم کو نیچا دکھاؤ گے پھر کیا
جفا و جور کی ذلت مٹاؤ گے پھر کیا تم اپنے بچوں کو قصے سناؤ گے پھر کیا

رہے گا قول یہی اُن سے اُن کی ماؤں کا
لہو رگوں میں تمھاری ہے بیحیاؤں کا

مٹا جو نام تو دولت کی جستجو کیا ہے　　نثار ہو نہ وطن پر تو آبرو کیا ہے

لگا دے آگ نہ دل میں تو آرزو کیا ہے　　نہ جوش کھائے جو غیرت سے وہ لہو کیا ہے

فدا وطن پہ جو ہو آدمی دلیر ہے وہ

جو یہ نہیں تو فقط ہڈیوں کا ڈھیر ہے وہ

قوم کے سورماؤں کی الوداع

ساحلِ ہند سے جرّارِ وطن جاتے ہیں　　۱۹۱۴ء؎ کچھ نئی شان سے جانبازِ کہن جاتے ہیں

رن میں باندھے ہوئے شمشیر و کفن جاتے ہیں　　تیغ زن برق فگن قلعہ شکن جاتے ہیں

سامنے اِن کے ظفر برہنہ پا چلتی ہے

اِن کے تلوار کے سایہ میں قضا چلتی ہے

اِن کی رگ رگ میں ہیں پیوست شجاعت کے چلن　　رن کا میدان ہے ان کے لئے ماں کا دامن

عرصۂ جنگ کی موت ان کو ہے اِک شب کی دلھن　　مر کے تلوار سے حاصل ہو تو خلعت ہے کفن

جوش ان میں جو ہے اس جوش کا اب دور نہیں

ساٹھ پُشتوں کے سپاہی ہیں کوئی اور نہیں

؎ یہ نظم اُس زمانہ میں تصنیف کی گئی تھی جب کہ ہندوستانی سپاہیوں کی فوج دولت برطانیہ کی جانب سے یورپ کی جنگ عظیم میں حصہ لینے کے لئے روانہ کی گئی تھی۔

ہاں دلیرانِ وطن دھاک بٹھا کر آنا　　طنطنہ جرمنِ خود بیں کا مٹا کر آنا
قیصری تخت کی بنیاد ہلا کر آنا　　ندیاں خون کی برلن میں بہا کر آنا

یہی گنگا ہے سپاہی کے نہانے کے لئے
ناؤ تلوار کی ہے پار لگانے کے لئے

جاں نثار آج تمھارا سا زمانہ میں نہیں　　ہاں دکھا دو کہ ہو تاجِ شہ لندن کے نگیں
دوست کیا چیز ہیں دشمن ہوں فدائے تحسیں　　آسماں و جد کرے بول اُٹھے رن کی زمیں

یوں تو لڑنے کو بہت شہ کے نمکخوار لڑے
اور ہی شان سے لیکن یہ وفادار لڑے

جس گھڑی معرکہ جنگ میں ہو تیغ علم　　سورما لڑتے ہیں اس طرح پکارے عالم
دل ہو ارجن کا جگر بھیم کا انگد کا قدم　　موت کے وقت نظر میں ہو شبیہ بھیشم

جس کا قابو نہ ہٹا موت کی تدبیروں پر
سایۂ تیغ میں آرام کیا تیروں پر

ہو وہ یورش کہ ہو شیرازۂ اعدا برہم　　اک اُمنڈتے ہوئے دریا کا ہو پیدا عالم
جو کسی سے نہ جھکا وہ سرِ مغرور ہو خم　　پہلے برلن میں جو پہونچے وہ تمھارا ہو قدم

"وہ گرو" کہہ کے بڑھو خون کے مغفر کھل جائیں
پھر ہری[1] سنگھ کی تلوار کے جوہر کھل جائیں

---

[1] مہاراجہ رنجیت سنگھ کا مشہور سپہ سالار۔

تم کو اعزاز ملا۔ ہے یہ وطن کا اعزاز　　دیکھنا اب ہے شجاعت کا تمھاری انداز
خاک یورپ پہ دلیری سے ہوا پنی ممتاز　　تیغ ہندی کی اصالت پہ زمانہ کو ہو ناز

قوم کا اوج بڑھے نام وطن زندہ ہو
روح پرتاب کی جنت میں نہ شرمندہ ہو

یا ظفریاب تمھیں دیکھ کے دل ہو بشاش　　آئے یا سوئے وطن خون میں ڈوبی ہوئی لاش
سر جدا تن سے ہو یا ہو تنِ بسمل صدپاش　　گوشۂ امن و اماں کی نہ ہو آنکھوں کو تلاش

موت معراج ہے اس دشت کے راہی کے لئے
آنچ تلوار کی جنت ہے سپاہی کے لئے

گو کہ دنیا سے مِٹے شوکتِ قیصر کا سُراغ　　شعلۂ تیغ سے مُرجھائے نہ تہذیب کا باغ
گل نہ ہو دل کے شوالے میں حمیت کا چراغ　　بے گناہوں کے لہو کا نہ ہو تلوار میں داغ

راستہ ہے یہی قوموں کی تباہی کے لئے
خون معصوم کا دوزخ ہے سپاہی کے لئے

مادرِ قوم کا ہے اپنے سپوتوں سے پیام　　خطۂ ہند کا اس جنگ میں روشن رہے نام
تیغ خونریز نے جس شان سے چھوڑا ہے نیام　　اپنے مسکن میں اُسی شان سے پائے آرام

شاعرِ گوشہ نشیں شکرِ خدا کرتا ہے
جنگ ہو تم کو مبارک یہ دعا کرتا ہے

نالۂ درد

سنہ ۱۹۱۸ء

(یہ نظم اُس وقت لکھی گئی تھی جب کانگرس کے قدیم لیڈر اس قومی مجلس سے مجبوراً علیحدہ ہو گئے تھے)

اپنے اپنے راگ سے کان آشنا ہونے کو ہیں
پردہ ہائے سازِ قومی بے صدا ہونے کو ہیں

رہنمائی کس کی ہو گی مجھ کو حیرت ہے یہی
قافلہ میں قوم کے سب پیشوا ہونے کو ہیں

جذبۂ خدمت صفائے قلب آئینِ ادب
خود نمائی پر یہ سب جوہر فدا ہونے کو ہیں

ہے طلبگاروں میں غُل کچھ سر اُٹھانا چاہیے
قوم کے دربار سے خلعت عطا ہونے کو ہیں

مانگتی ہے روز جن سے روشنی صبحِ وطن
خون کے قطرے اُن آنکھوں سے جُدا ہونے کو ہیں

آنسوؤں سے اپنے جو سینچا کیے باغِ وطن
بیوفائی کے انھیں خلعت عطا ہونے کو ہیں

جن کو منزل سے زیادہ ہے ہوا کا رُخ عزیز
قوم کے بیڑے کے ایسے ناخُدا ہونے کو ہیں

یادگارِ دورِ آخر ہیں جو کچھ حرماں نصیب
وہ اسیرِ کاوشِ جرمِ وفا ہونے کو ہیں

جو صفائے حُسن سے صورت نمائے قوم تھے
دل کے آئینوں سے وہ جوہر فنا ہونے کو ہیں

کچھ عجب رنگِ چمن بدلا ہوا ہے آج کل
غنچہ و گُل صورتِ شبنم ہوا ہونے کو ہیں

R گر یہی ہے گردشِ دوراں کا رنگِ انقلاب　　ہوش اُڑ جائیں گے وہ فتنے بپا ہونے کو ہیں

R جراتِ اخلاق تیرے امتحاں کا وقت ہے　　خود عزیزانِ وطن ہم سے خفا ہونے کو ہیں

R مادرِ ناشاد روتی ہے کوئی سُنتا نہیں
دل جگر سے بھائی سے بھائی جُدا ہونے کو ہیں
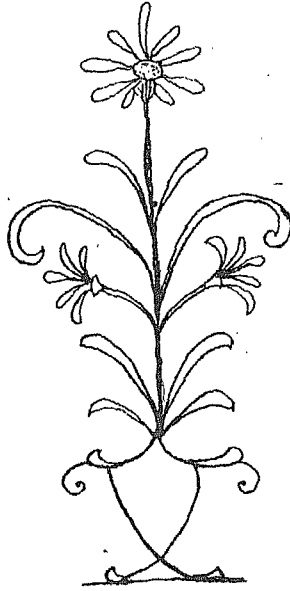
ہم ہوں گے عیش ہوگا اور ہوم رول ہوگا

۱۹۱۶ء

اہلِ وطن مبارک تم کو یہ بزم اعلےٰ
جس میں نئی اُمیدوں کا ہے نیا اُجالا
دُنیا کے مذہبوں سے یہ رنگ ہے نرالا
مسجد یہی ہے اپنی اور ہے یہی شوالا

ہو ہوم رول حاصل ارمان ہے تو یہ ہے
اب دین ہے تو یہ ہے ایمان ہے تو یہ ہے

شیدائے بوستاں کو سرو وسمن مبارک
رنگیں طبیعتوں کو رنگِ سخن مبارک
بُلبُل کو گُل مبارک گُل کو چمن مبارک
ہم بیکسوں کو اپنا پیارا وطن مبارک

غُنچے ہمارے دل کے اس باغ میں کھلیں گے
اِس خاک سے اُٹھے ہیں اس خاک میں ملیں گے

اِس خاکِ دل نشیں پر بادل سا چھا رہا ہے
طوفان بیکسی کا ہم کو ستا رہا ہے
لیکن یہ دَورِ حسرت دُنیا سے جا رہا ہے
مایوس ہو نہ جانا وہ دن بھی آ رہا ہے

برطانیہ کا سایہ سر پر قبول ہوگا
ہم ہوں گے عیش ہوگا اور ہوم رول ہوگا

؏ یہ نظم لکھنؤ میں دسمبر ۱۹۱۶ء کی کانگریس کے اجلاس میں گائی گئی تھی۔

ہماراوطن دل سے پیارا وطن

(چھوٹے بچّوں کے لئے)]

۱۹۱۶ء

یہ ہندوستاں ہے ہماراوطن محبّت کی آنکھوں کا تارا وطن
ہمارا وطن دل سے پیارا وطن

وہ اس کے درختوں کی تیّاریاں وہ پھل پھول پودے وہ پھلواریاں
ہمارا وطن دل سے پیارا وطن

ہوا میں درختوں کا وہ جھومنا وہ پتّوں کا پھولوں کا مُنہ چومنا
ہمارا وطن دل سے پیارا وطن

وہ ساون میں کالی گھٹا کی بہار وہ برسات کی ہلکی ہلکی پھوہار
ہمارا وطن دل سے پیارا وطن

وہ باغوں میں کوئل وہ جنگل کے مور وہ گنگا کی لہریں وہ جمنا کا زور
ہمارا وطن دل سے پیارا وطن

اِسی سے ہے اس زندگی کی بہار وطن کی محبّت ہو یا ماں کا پیار
ہمارا وطن دل سے پیارا وطن

وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک

(بچّوں کے لئے)

۱۹۱۶ء

یہ پیاری انجمن ہم کو مبارک یہ اُلفت کا چمن ہم کو مبارک

وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک

یہاں کی خاک ہم کو کیمیا ہے یہ سونے سے بھی قیمت میں سوا ہے

وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک

جو چڑیاں صبح کو گاتی ہیں اکثر اِسی کا راگ ہے ان کی زباں پر

وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک

وہ ساون کے مہینے کی گھٹائیں وہ کوئل اور پپیہے کی صدائیں

وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک

وہ اک مستی کا عالم بادلوں میں وہ پھولوں کا مہکنا جنگلوں میں

وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک

وہ چشمے اور وہ امرت سا پانی وہ گنگا اور جمنا کی روانی

وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک

درختوں پر وہ چڑیوں کا چہکنا وہ بیلے اور چنبیلی کا مہکنا

وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک

اِسی کی خاک سے لیتے ہیں محصول یہی دیتا ہے غلّہ اور پھل پھول

وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک

وطن کا جن بزرگوں سے ہُوا نام اِسی مٹّی میں وہ کرتے ہیں آرام

وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک
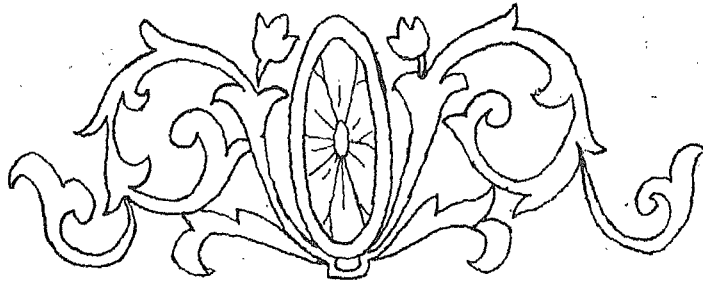
حصّہ دوم

پھول مالا

(قوم کی لڑکیوں سے خطاب)

سنہ ۱۹۱۷ء

روشِ خام پہ مردوں کی نہ جانا ہرگز — داغ تعلیم میں اپنی نہ لگانا ہرگز

نام رکھا ہے نمایش کا ترقّی و رفارم — تم اس انداز کے دھوکے میں نہ آنا ہرگز

رنگ ہے جن میں مگر بوئے وفا کچھ بھی نہیں — ایسے پھولوں سے نہ گھر اپنا سجانا ہرگز

نقلِ یورپ کی مناسب ہے مگر یاد رہے — خاک میں غیرتِ قومی نہ ملانا ہرگز

خود جو کرتے ہیں زمانہ کی روش کو بدنام — ساتھ دیتا نہیں ایسوں کا زمانا ہرگز

خود پرستی کو لقب دیتے ہیں آزادی کا — ایسے اخلاق پہ ایمان نہ لانا ہرگز

رنگ و روغن تمھیں یورپ کا مبارک لیکن — قوم کا نقش نہ چہرے سے مٹانا ہرگز

جو بناتے ہیں نمایش کا کھلونا تم کو — اُن کی خاطر سے یہ ذلّت نہ اٹھانا ہرگز

رُخ سے پردہ کو اُٹھایا تو بہت خوب کیا — پردۂ شرم کو دل سے نہ اُٹھانا ہرگز

تم کو قدرت نے جو بخشا ہے حیا کا زیور — مول اس کا نہیں قاروں کا خزانا ہرگز

دل تمھارا ہے وفاؤں کی پرستش کے لئے — اِس محبّت کے شوالہ کو نہ ڈھانا ہرگز

پوجنے کے لئے مندر جو ہے آزادی کا	اس کو تفریح کا مرکز نہ بنانا ہرگز
نقد اخلاق کا ہم نل کی طرح ہار چکے	تم ہو دمینت یہ دولت نہ لُٹانا ہرگز
خاک میں دفن ہیں مذہب کے پُرانے پاکھنڈ	تُم یہ سوتے ہوئے فتنے نہ جگانا ہرگز
اپنے بچّوں کی خبر قوم کے مردوں کو نہیں	یہ ہیں معصوم انھیں بھول نہ جانا ہرگز
ان کی تعلیم کا مکتب ہے تمھارا زانو	پاس مردوں کے نہیں ان کا ٹھکانا ہرگز
کاغذی پھول ولایت کے دکھا کر ان کو	دیس کے باغ سے نفرت نہ دلانا ہرگز
نغمۂ قوم کی لے جس میں سما ہی نہ سکے	راگ ایسا کوئی ان کو نہ سکھانا ہرگز
پرورش قوم کی دامن میں تمھارے ہوگی	یاد اس فرض کی دل سے نہ بُھلانا ہرگز
گو بزرگوں میں تمھارے نہ ہو اس وقت کا رنگ	ان ضعیفوں کو نہ ہنس ہنس کے رُلانا ہرگز
ہوگا پرلے جو گرا آنکھ سے اِن کی آنسو	بچپنے سے نہ یہ طوفان اُٹھانا ہرگز
ہم تمھیں بھول گئے اس کی سزا پاتے ہیں	تُم ذرا اپنے تئیں بھول نہ جانا ہرگز

کس کے دل میں ہے وفا کس کی زباں میں تاثیر
نہ سُنا ہے نہ سُنوگی یہ فسانا ہرگز

۱؎ قیامت۔

برقِ اصلاح

۱۹۱۷ء

مرحبا معجزاتِ اصلاح دلانے والو		قوم کے بارِ امانت کے اُٹھانے والو
دل کی اُجڑی ہوئی نگری کے بسانے والو		مادرِ ہند کی بگڑی کے بنانے والو

کیسے طوفاں میں دیا ہے یہ سہارا تم نے
خوب ڈوبی ہوئی کشتی کو اُبھارا تم نے

کل جسے حسنِ لطافت میں خزاں نے لوٹا		آج اُس باغ کا شاداب ہے بوٹا بوٹا
بیڑیاں کٹ کے گریں قفلِ اسیری ٹوٹا		چاند معصوم کی قسمت کا گہن سے چھوٹا

تم بھی خود شاد ہوئے قوم کو بھی شاد کیا
دل کے ویران شوالے کو پھر آباد کیا

قوم میں گلشنِ اصلاح پڑا تھا ویراں		طائرِ باغ تھے بے بال و پری سے نالاں
ہو گیا اور ہی قدموں سے تمھارے ساماں		ایسے دلسوز چمن بند میسّر ہیں کہاں

قوم دیتی ہے دُعا نام تمھارا سُن کر
راستہ صاف کیا باغ سے کانٹے چُن کر

عہ کشمیری پنڈتوں کے فرقہ میں پہلی مرتبہ ایک بیوہ لڑکی کی شادی آگرہ میں ہوئی تھی۔ اس اصلاح کے خیر مقدم میں یہ نظم تصنیف کی گئی تھی۔

رل گئے خاک میں کتنے ہی غریبوں کے شباب — ان گناہوں کا ہے اس قوم کی گردن پہ عذاب
جو پرانی روشوں کے لئے رہتے ہیں خراب — ان کی صورت سے اب آتا ہے زمانہ کو حجاب

شانِ اخلاق نہیں جبر کی تدبیروں میں
بے گناہوں کو جکڑتے نہیں زنجیروں میں

بے گنہ ظلم سے ہو جاتے ہیں اکثر معذور — مگر انصاف کا دربار بھی ہوتا ہے ضرور
قوم کے جبر کا لیکن ہے نرالا دستور — یہ ہو پابندِ جہالت تو ہے دُنیا مجبور

دل تو کیا روح بھی اس قید سے آزاد نہیں
یہ ہے وہ ظلم کہ جس کی کہیں فریاد نہیں

آج اس ظلم کی بُنیاد ہلی جاتی ہے — خاک میں حجّتِ دیرینہ ملی جاتی ہے
رحم کا راج ہے اب سنگ دلی جاتی ہے — یاں کلی دل کی محبت سے کھلی جاتی ہے

مرد قوموں کو سبق یوں ہی سکھا دیتے ہیں
دل میں جو ٹھانتے ہیں کر کے دکھا دیتے ہیں

نوجوانوں پہ ہے کیا جوش کا عالم طاری — معرکہ سر ہو یہ ہے چار طرف تیاری
طنطنہ دل میں ہے لب پر یہ سخن ہے جاری — نام کشمیر کا ڈوبے گا جو ہمّت ہاری

آ کے میدانِ ترقی میں پلٹنے کے نہیں
یہ قدم وہ ہیں جو بڑھ جائیں تو ہٹنے کے نہیں

ہے اِدھر جوش پہ آزاد خیالی کو ترنگ
سر میں سودا ہے دلوں میں ہے جوانی کی اُمنگ
اس طرف بزم حریفاں کا ہے اُکھڑا ہوا رنگ
ڈھونڈھتے پھرتے ہیں نفریں کے لئے ہم آہنگ

کوئی باقی نہیں اب ان کے طرفداروں میں
مل گئی ٹوٹ کے توبہ بھی گنہگاروں میں

آئیں پیرانِ طریقت یہ تماشا دیکھیں
ہاں نئے دَور کا اُٹھتا ہوا پردا دیکھیں
جوش اصلاح کا بہتا ہوا دریا دیکھیں
پار ہوتے ہوئے مظلوم کا بیڑا دیکھیں

دیکھ لیں دھرم کی اس قوم میں خو باقی ہے
ان رگوں میں ابھی رشیوں کا لہو باقی ہے

ضعف اخلاق سے تھے قوم کے اعضا بیکار
دل کی راحت طلبی سے تھیں اُمنگیں لاچار
بعد مُدت ہوئے غیرت کے نُمایاں آثار
نوکِ نشتر سے ہوا خون رگوں میں بیدار

یُوں ہی اصلاح کی تاثیر عیاں ہوتی ہے
قوم پیری میں اسی طرح جواں ہوتی ہے

حالتِ زخم سے جب حالتِ ناسور ہوئی
فکر مرہم دلِ پُر درد کو منظور ہوئی
جورِ مذہب کی بلا قوم سے کافور ہوئی
شکر ہے گائے کی گردن سے چُھری دور ہوئی

غم نہیں دل کو یہاں دین کی بربادی کا
بُت سلامت رہے انسان کی آزادی کا

دردِ دل[ع]

(تمہید)

۱۹۱۲ء

درد ہے دل کے لئے اور دل انساں کے لئے
تازگی برگ و ثمر کی چمنستاں کے لئے

سازِ آہنگِ جنوں تار رگِ جاں کے لئے
بیخودی شوق کی مجھ بے سروساماں کے لئے

کیا کہوں کون ہوا سر میں بھری رہتی ہے
بے پئے آٹھ پہر بے خبری رہتی ہے

نہ ہوں شاعر نہ ولی ہوں نہ ہوں اعجاز بیاں
بزمِ قدرت میں ہوں تصویر کی صورت حیراں

دل میں اک رنگ ہے لفظوں سے جو ہوتا ہے عیاں
لے کی محتاج نہیں ہے مری فریاد و فغاں

شوقِ شہرت ہوسِ گرمیٔ بازار نہیں
دل وہ یوسف ہے جسے فکرِ خریدار نہیں

اور ہوں گے جنھیں ہوتا ہے مقدر سے گلا
اور ہوں گے جنھیں ملتا نہیں محنت کا صلا

میں نے جو غیب کی سرکار سے مانگا وہ ملا
جو عقیدہ تھا مِرے دل کا ہلائے نہ ہلا

کیوں ڈراتے ہیں عبث گبر و مسلماں مجھ کو
کیا مٹائے گی بھلا گردشِ دوراں مجھ کو

ع یہ نظم لکھنؤ کی انجمن نوجوانانِ کشمیر کے آٹھویں سالانہ جلسہ میں پڑھی گئی تھی۔ اس انجمن کی ترقی میں مصنف کو خاص دلچسپی تھی۔

کیا زمانہ پہ کھلے بے خبری کا مری راز　　طائرِ فکر میں پیدا تو ہوا اتنی پرواز
کیوں طبیعت کو نہ ہو بیخودیٔ شوق پہ ناز　　حضرتِ آبر[1] کے قدموں پہ ہے یہ فرقِ نیاز

فخر ہے مجھ کو اسی در سے شرف پانے کا
مَیں شرابی ہوں اسی رند کے میخانے کا

دل مرا دولتِ دُنیا کا طلبگار نہیں　　بخدا خاک نشینی سے مجھے عار نہیں
مست ہوں حُبِّ وطن سے کوئی میخوار نہیں　　مجھ کو مغرب کی نمایش سے سروکار نہیں

اپنے ہی دل کا پیالہ پیے مدہوش ہوں مَیں
جھوٹی پیتا نہیں مغرب کی وہ مے نوش ہوں مَیں

قوم کے درد سے ہوں سوزِ وفا کی تصویر　　میری رگ رگ سے ہے پیدا تپِ غم کی تاثیر
ہے مگر آج نظر میں وہ بہار دل گیر　　کرلیا دل کو فرشتوں نے طرب کے تسخیر

یہ نسیمِ سحری آج خبر لائی ہے
سال گذرا مرے گلشن میں بہار آئی ہے

(ترقیِ انجمن)

قوم میں آٹھ برس سے ہے یہ گلشن شاداب　　چہرۂ گُل پہ یہاں پاسِ ادب کی ہے نقاب
میرے آئینۂ دل میں ہے نقط اس کا جواب　　اس کے کانٹوں پہ کیا میں نے نثار اپنا شباب

---

[1] پنڈت بشن نراین در متخلص بہ آبر۔

کام شبنم کا لیا دیدۂ تر سے اپنے
مَیں نے سینچا ہے اسے خونِ جگر سے اپنے

ہر برس رنگ پہ آتا ہی گیا یہ گلزار — پھول تہذیب کے کھلتے گئے مٹتے گئے خار
پتّی پتّی سے ہوا رنگِ وفا کا اظہار — نوجوانانِ چمن بن گئے تصویرِ بہار

رنگِ گُل دیکھ کے دل قوم کا دیوانہ ہوا
جو تھا بدخواہِ چمن سبزۂ بیگانہ ہوا

بوئے نخوت سے نہیں یاں کے گُلوں کو سروکار — ہے بزرگوں کا ادب اِن کی جوانی کا سنگار
علم و ایماں کی طراوت کا دلوں میں ہے گزار — دھو گئے چشمۂ اخلاق سے سینوں کے غبار

رنگ کھلاتی ہے یوں دل کی صفا یاروں میں
روشنی صبح کی جس طرح ہو گلزاروں میں

کس کو معلوم تھی اِس گُلشنِ اخلاق کی راہ — مَیں نے پھولوں کو کیا رنگِ وفا سے آگاہ
اب تو اس باغ پہ ہے سب کی محبت کی نگاہ — جو کہ پودے تھے شجر ہو گئے ماشاء اللہ

کیا کہوں رنگ جوانی میں جو اس باغ کے تھے
باغباں ہو گئے گلچیں جو مرے باغ کے تھے

گو کہ باقی نہیں کیفیتِ طوفانِ شباب — پھنس کے جنجال میں دُنیا کے یہ قصہ ہوا خواب
مست رہتا ہے مگر اب بھی دلِ خانہ خراب — شام کو بیٹھ کے محفل میں لنڈھاتا ہوں شراب

نشۂ علم کی اُمید پہ جینے والے
سمٹ آتے ہیں سرِ شام سے پینے والے

اور ہی رنگ پہ ہے آج بہارِ گلشن — سیر کے واسطے آئے ہیں عزیزانِ وطن
فرش آنکھیں کئے بیٹھے ہیں جوانانِ چمن — دل میں طوفانِ طرب لب پہ محبت کے سخن

کون ہے آج جو اس بزم میں مسرور نہیں
روحِ سرشار[۱] بھی کھنچ آئے تو کچھ دور نہیں

مگر افسوس یہ دُنیا ہے مقامِ عبرت — رنج کی یاد دلاتا ہے خیالِ راحت
آج یاد آتی ہے اُن پھولوں کی مجھ کو صورت — کھلتے ہی کر گئے جو میرے چمن سے رحلت

چشمِ بد دور گلوں کی یہ بھری ڈالی ہے
چند پھولوں کی مگر اس میں جگہ خالی ہے

یہ وہ گُل تھے جنھیں اربابِ نظر نے رویا — بھائی نے بہنوں نے مادر نے پدر نے رویا
خاک رونا تھا جو اِس دیدۂ تر نے رویا — مدتوں اُن کو مرے قلب و جگر نے رویا

دل پہ کچھ داغِ محبت ہیں نشانی اُن کی
بچپنا دیکھ کے دیکھی نہ جوانی اُن کی

خیر دُنیا میں کبھی سوز ہے اور ہے کبھی ساز — نونہالانِ چمن کی رہے اب عمر دراز
بھائی سے بڑھ کے مجھے ہیں یہ مرے مایۂ ناز — میرے مونس ہیں یہی اور یہی میرے ہمراز

---

[۱] پنڈت رتن ناتھ در سرشار مرحوم۔

مر کے بھی روح مری دل کی طرح شاد رہے
میں رہوں یا نہ رہوں یہ چمن[1] آباد رہے

(حالتِ قوم)

زندگی کا نہیں دُنیا میں بھروسا اک آن
آج وہ اُٹھ گئے کرتے تھے جو کل کا سامان
عرضِ حال آج ہے لازم کہ ابھی تر ہے زبان
آپ کے فیض کا سر ڈھونڈھ رہا ہے احسان
آپ ہیں ابرِ کرم پاسِ چمن لازم ہے
سرپرستیِ عزیزانِ وطن لازم ہے

آپ جس قوم کے ہیں رُکن رکیں اور افسر
ہیں اسی قوم کے یہ طفل و جواں نورِ نظر
ان میں پیدا ہوئے گر علم و ادب کے جوہر
مادرِ قوم کی چھاتی سے ہٹے گا پتّھر
آپ کو چین نہیں ان کی اگر خیر نہیں
قوم کے لختِ جگر ہیں یہ کوئی غیر نہیں

گلشنِ قوم میں ہے پیشِ نظر رنگ عجیب
فتنے جاگے ہوئے ہیں خوابِ گراں میں ہے نصیب
دل محبت سے خفا ہیں تو مروّت کے رقیب
دور ہیں دل سے جو آنکھوں سے ہیں ہر وقت قریب
اب وہ پہلے کی محبت وہ بھلائی ہے کہاں
دِل کے آئینوں میں اگلی سی صفائی ہے کہاں

---

[1] انجمن۔

کس کو دُکھ درد کی غیروں کے خبر رہتی ہے
حالتِ اہلِ وفا نوعِ دگر رہتی ہے

رات دن عیش پرستی پہ نظر رہتی ہے
ہوسِ دولت وزر شام وسحر رہتی ہے

نوجوانوں میں وہ اگلی سی محبت ہے کہاں
جو بزرگوں نے کمائی تھی وہ دولت ہے کہاں

کوئی سودائے محبت کا خریدار نہیں
جوشِ اُلفت کی ذرا گرمیٔ بازار نہیں

پیٹھ کے پیچھے بُرا کہنے میں کچھ عار نہیں
جو ہے رفتارِ خیالات وہ گفتار نہیں

فرق کیا ظاہر و باطن کا بُرا ہوتا ہے
جو زباں کہتی ہے دل سُن کے اُسے روتا ہے

دولتِ علم و ہُنر میں بھی نُمایاں ہے زوال
ہو رہا ہے چمنستانِ ذہانت پامال

سر میں سودا وہ نہیں جس سے میسّر ہو کمال
پڑھنے لکھنے کا فقط دولتِ دُنیا ہے مآل

عمر یُوں علم کے سانچے میں ڈھلی جاتی ہے
اِک تجارت ہے کہ دِن رات چلی جاتی ہے

کفر ہے جو ہنر ذاتی کے لئے نشو و نُما
ذات انساں کی محبّت ہے نہ ہے خوفِ خُدا

سرِ مغرور سے ہے دُور وفا کا سودا
شانِ ظاہر کی تمنّا میں ہیں دولت پہ فدا

جان سے شوقِ نمایش میں گذر جائیں ابھی
قبر چاندی کی جو مل جائے تو مر جائیں ابھی

جج اکبر سے جو یورپ کے ہوئے ہیں ممتاز	ہے وطن میں بھی غریب الوطنی پر انہیں ناز
پیر یارانِ طریقت ہے غیروں سے ہے ساز	وہ بنائی ہوئی چتون وہ انیلے انداز

لب و لہجہ میں لگاوٹ ہے طرحداری ہے
اک فقط رنگ پہ قابو نہیں لاچاری ہے

اُن کو تہذیب سے یورپ کی نہیں کچھ سروکار	ظاہری شان و نمایش پہ دل و جاں ہیں نثار
ہیں وہ سینے میں کہاں غیرتِ قومی کے شرار	جن سے مغربع میں ہوئے خاک کے پتلے بیدار

سیرِ یورپ سے یہ اخلاق و ادب سیکھا ہے
ناچنا سیکھا ہے اور لہو و لعب سیکھا ہے

(نوجوانوں سے خطاب)

ہاں جوانانِ وطن خواب سے بیدار ہو اب	سو چکے رات بھی آخر ہوئی ہشیار ہو اب
سحرِ نورِ وفا کے لئے تیار ہو اب	دردِ دل کچھ مجھے کہنا ہے خبردار ہو اب

بے خودی دل کی ہے تصویر بیاں میری ہے
مرثیہ قوم کا ہے اور زباں میری ہے

نکتہ چینی سے غرض ہے نہ دل آزاری ہے	صرف منظور نظر خواب سے بیداری ہے
غفلتِ عیش دلوں پر جو یہاں طاری ہے	بے خودی کہتے ہیں اس کو کہ یہ ہشیاری ہے

ع یورپ۔

کیا کیے جاتے ہو کیا مُنہ سے کہے جاتے ہو
کچھ خبر ہے تمھیں کس سمت بہے جاتے ہو

چمنِ عمر ہمیشہ نہ رہے گا شاداب | خُم میں باقی نہ رہے گی یہ جوانی کی شراب
نشۂ علم میں ہر وقت رہو تُم غرقاب | شانِ تعلیم یہی ہے یہی تہذیب شباب

لے اُڑے دل کو طبیعت کی روانی وہ ہے
بے پیے نشہ رہے جس میں جوانی وہ ہے

مست کر دیتی ہے ایسا یہ شرابِ سرجوش | نظر آتی ہے مے حُسن سے دُنیا مدہوش
سیرِ جنت میں رہا کرتے ہیں چشم ولب و گوش | مجھ سے کہتا تھا جوانی میں مرا بادہ فروش

ہر گھڑی عالمِ بالا پہ نظر رہتی ہے
کہیں انسان کو دُنیا کی خبر رہتی ہے

نشۂ علم میں تُم میں سے نہیں کوئی بھی چور | دخل رہتا ہے طبیعت میں تعلّی کو ضرور
ہو گیا ہے جو ذرا چار کتابوں پہ عبور | تو غضب کی ہمہ دانی ہے قیامت کا غرور

شان ارسطو کی بھی فرعون کا سامان بھی ہے
وہی گھر مصر بھی ہے اور وہی یونان بھی ہے

علم و اخلاق کے دامن پہ تمھارے ہے یہ داغ | جو بزرگوں نے لگایا تھا اُجڑتا ہے وہ باغ
تُم کو اللہ نے بخشے ہیں وہ دل اور وہ دماغ | جس سے روشن ہو زمانہ کی ترقی کا چراغ

اِک ذرا جذبۂ اخلاق کو اعلےٰ کر دو
قوم مرحوم کی تُربت پہ اجالا کر دو

تُم مدد کے نہیں محتاج یہ میں نے مانا — ہو مگر فکر سے بچّوں کی نہ یُوں بیگانا
بارِ احساں سے سُبکدوش ہو گر ہو دانا — ایک دِن قوم کے آگے نہ پڑے شرمانا

تُم کو بچّوں کا بڑا فرض ادا کرنا ہے
ہے تو ایمان کی یہ، قرض ادا کرنا ہے

انھیں بچّوں کی محبت ہوئی ہے دامن گیر — آپ کی شمع خراشی کی جو کی یہ تدبیر
اپنے دردِ دلِ ناشاد کی ہے یہ تفسیر — اشک حسرت سے کیا ہے اسے دل نے تحریر

چاہے مجذوب کی بڑ چاہے نصیحت سمجھو
یا ہمارے دلِ مردہ کی وصیّت سمجھو
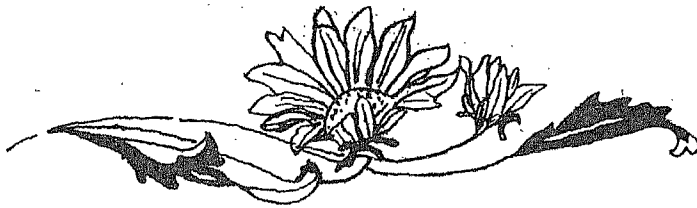
نالۂ یاس

سنہ ۱۹۱۸ء

کیا کہیں کس سے کہیں ہم آج کیا کہنے کو ہیں — آخری افسانۂ شوقِ وفا کہنے کو ہیں
جن اُمیدوں کی لڑکپن میں ہوئی تھی ابتدا — آج اُن کی انتہا کا ماجرا کہنے کو ہیں
بے خبر اب بھی نہیں ہم قوم کے دُکھ درد سے — پہلے ہمت تھی دَوا کی اب دُعا کہنے کو ہیں

کیا کہیں کیا دَورِ آخر میں ستم دیکھا کئے
برہمی بڑھتی گئی محفل کی ہم دیکھا کئے

وہ بھی کیا عالم تھا جب دُنیا سے دِل آزاد تھا — اور سب بھولے تھے ایک قصّۂ وفا کا یاد تھا
قوم کا سودا وفا کا شوق خدمت کی اُمنگ — بس انہیں دو تین کے صدقہ میں دِل آباد تھا
کوفت تھی ہم کو اگر گمراہ تھا بچہ کوئی — ہم بھی خوش تھے گر کسی معصوم کا دِل شاد تھا
تھی اِسی رنگِ محبت سے اُمیدوں کی بہار — کیسے کیسے پھول تھے کیسا چمن آباد تھا

ہم یہ برسوں کی محبت بھولنے والے نہیں
اِتنے بھائی ایک ماں کی گود نے پالے نہیں

حیف یہ مجموعۂ صحبت پریشاں ہو گیا — بستیوں میں پھول پہونچے باغ ویراں ہو گیا

مل گیا اہلِ چمن کو پھر بھی خدمت کا صلہ قوم کا دامن کسی گلچیں کا داماں ہو گیا

رنگ تاثیرِ چمن بکھرے ہوئے پھولوں میں ہے کیا ہُوا خالی اگر صحنِ گلستاں ہو گیا

ہم جہاں ہیں انجمن کی وضع اپنے ساتھ ہے جس جگہ پہونچے وہی عالم نمایاں ہو گیا

غنچۂ احباب کی تصویر ہے سینہ کے ساتھ دل کی ہر لبتی میں ایک محفل کا ساماں ہو گیا

نشہ سے غافل ہمارے رند او ساقی نہیں
گو کہ محفل اُٹھ گئی جام و سبو باقی نہیں

گو کہ اگلے باغباں جنجال سے چھوٹے نہیں پر ابھی اس باغ کے دیوار و در ٹوٹے نہیں

انتظارِ شوق میں در پر کھڑی ہے نو بہار پیشوائی کے لئے پھل پھول گُل بوٹے نہیں

یاس کہتی ہے کہ جمنے کا نہیں رنگِ چمن آرزو کہتی ہے اگلا سلسلہ ٹوٹے نہیں

آپ اگر پیغام دیں بادِ بہاری کے لئے
آئیں گے اہلِ چمن پھر آبیاری کے لئے

کرشن کنھیّا

(جنم اسٹمی)

آج کی رات کا دُنیا کے لئے کیا ہے پیام　　حُسنِ قدرت کا سرِ شام سے ہے جلوۂ عام
نور برساتے ہیں تاروں کے چھلکتے ہوئے جام　　بن گیا سازِ طرب ہستیِ عالم کا نظام

فرشِ راحت پر اگر آنکھ جھپک جاتی ہے
بانسری کی میرے کانوں میں صدا آتی ہے

بے حجابی کی عروسانِ چمن میں ہے صدا　　گُل کا نکہت سے اشارہ ہے کہ پردہ کیسا
دل میں پیوست ہوئی جاتی ہے موروں کی نوا　　ہُن برسنے کو ہے کہتی ہے یہ پورپ کی ہوا

پیشوائی کے لئے خلقِ خدا اُٹھی ہے
آج جمنا کے کنارے سے گھٹا اُٹھی ہے

شبِ تاریک کے قبضہ میں ہے ایوانِ فلک　　جھپکی جاتی ہے اندھیرے میں ستاروں کی پلک
وہ ہوا ہے کہ اُڑے جاتے ہیں فانوس تلک　　نظر آتی نہیں بستی میں چراغوں کی جھلک

صرف جگنو ہے جو دیوانہ صفت پھرتا ہے
شمع لیکر کبھی اُٹھتا ہے کبھی گرتا ہے

سنسناتی ہوئی آتی ہے اندھیرے میں ہوا　　شجر و شاخ کے نغمہ سے ہے معمور فضا
بجلیاں کوندتی ہیں لاکھ گرجتی ہے گھٹا　　نے کے باہر نہیں ہوتی ہے پپیہے کی صدا

درد کے نام سے نعمت اسے ہاتھ آئی ہے
ایک ہی راگ کا دُنیا میں یہ شیدائی ہے

چھا گیا ابر برسنے کو ہیں مینہ کے جھالے　　آپ ہی آپ ہوئے جاتے ہیں دل متوالے
آنکھ کہتی ہے یہ بادل نہیں کالے کالے　　بال کھولے ہوئے ہیں سانولی صورت والے

کشتیِ فکر بہی جاتی ہے جمنا کی طرف
دل مرا کھینچ رہا ہے مجھے متھرا کی طرف

راہ تاریک ہے اور سر پہ گرج بادل کی　　دونگڑا مینہ کا ہے بوندیں نہیں ہلکی ہلکی
شوخ و طرّار و حسین چھوکریاں گوکل کی　　چلی آتی ہیں صراحی لئے جمنا جل کی

دل لڑکپن کی اُمنگوں پہ مچل جاتا ہے
کھلکھلا پڑتی ہیں جب پاؤں پھسل جاتا ہے

یہ خوشی ہے کہ مناتا ہے کنھیّا کہ جنم　　دل میں ارمان ہزاروں ہیں مگر وقت ہے کم
نہیں سینے میں سماتا یہ ہے دل کا عالم　　آنکھ پڑتی ہے کہیں اور کہیں پڑتا ہے قدم

ایک کو ایک کی صورت جو نظر آتی ہے
مُسکرا دیتی ہیں جب برق چمک جاتی ہے

آج سوتی ہوئی دُنیا کی ہے قسمت بیدار　　سال بھر بعد وہ رات آئی ہے دل جس پہ نثار
یہی بجلی تھی یہی ابر یہی جوشِ بہار　　جب کنھیا کے جنم سے ہوئی روشن شب تار

قید خانہ کی سیاہی میں وہ تارا چمکا
جس سے انسان کی ہستی کا ستارا چمکا

تھا جو دُنیا کو رہِ راست پہ لانا منظور　　جلوۂ حق نے کیا قالبِ خاکی میں ظہور
جوشِ رحمت سے غنی فیض و کرم سے معمور　　ظلمتِ جہل مٹانے کو بڑھا چشمۂ نور

پردۂ غیب سے متھرا کے چمن تک پہونچا
بڑھ کے متھرا سے کرو کشیتر کے رن تک پہونچا

دیکھ کر جنگ کے طوفان میں ارجن کو اُداس　　یُوں دیا وعظ کہ ہوشیار ہوا کشتۂ یاس
روح و قالب کی جُدائی پہ عبث ہے وسواس　　جو مسافر ہے وہ منزل پہ بدلتا ہے لباس

روح دُنیا کی مسافر ہے اجل منزل ہے
اس سفر میں جو کھٹکتا ہے وہ کانٹا دل ہے

صاف نیت ہے تو بیکار ہے انجام کا ڈر　　پاک بندے جو ہیں رکھتے ہیں فقط حق پہ نظر
خود ریاضت کو سمجھتے ہیں ریاضت کا ثمر　　پھل کے لالچ میں لگاتے نہیں نیکی کا شجر

اُن کی آنکھوں میں وہی داغ وفا پیارے ہیں
خود غرض کے لئے جو آگ کے انگارے ہیں

پھول مایا کے جو کھلتے ہیں لُبھانے کے لئے　　سانپ بچھو ہیں مسافر کے ستانے کے لئے
سلسلہ ہستیِ فانی کا مٹانے کے لئے　　بزم عالم سے نہ جا لوٹ کے آنے کے لئے

تیری ہستی کا جو ہے راگ بھلا دے اُس کو
پردۂ سازِ حقیقت میں چھپا دے اُس کو

کِس لئے خاک کے پُتلوں کے لئے روتا ہے　　دیکھنے کو ہے کھُلی آنکھ مگر سوتا ہے
کچھ خبر ہے تجھے کیوں جان عبث کھوتا ہے　　کون کرتا ہے فنا کون فنا ہوتا ہے

دوست دُشمن کا مددگار وہی جنگ میں ہے
ایک صورت گرِ ہستی ہے جو ہر رنگ میں ہے

وہی بسمل ہے وہی جوہرِ شمشیر بھی ہے　　شعلۂ شمع وہی ہے وہی گلگیر بھی ہے
خود مصوّر ہے وہی اور وہی تصویر بھی ہے　　وہی حاکم وہی قیدی وہی زنجیر بھی ہے

جوہری بھی ہے وہی جوہرِ عالی بھی وہی
پھول بھی ہے وہی اس باغ کا مالی بھی وہی

تیری آنکھوں سے اگر دُور ہو مایا کی نقاب　　دیکھ پھر کیا نظر آتے ہیں عزیز اور احباب
بے وفاؤں کی مروّت میں نہ کر جسم خراب　　حق پرستوں کی امانت ہے ترا زورِ شباب

دھرم پر جو نہ فدا ہو وہ جوانی کیا ہے
دودھ کی دھار ہے تلوار کا پانی کیا ہے

اب نہ ارجن ہے نہ وہ گیان کا دریا باقی　　　　نہ وہ آنکھیں ہیں نہ وہ نور کا جلوا باقی

دل لبھانے کو ہے دُنیا کا تماشا باقی　　　　درد باقی ہے نہ ہے درد کا شیدا باقی

بانسری لے کے نیا راگ سُنا دے کوئی

سو رہا ہے دلِ مایوس جگا دے کوئی

پھر ہو دُنیا میں کسی ہستی کامل کا ظہور　　　　دل میں جس کے ہو سمایا ہوا خدمت کا سرور

جذبۂ خیر کی ہو جس کو پرستش منظور　　　　بادۂ شوق سے ہوں جس کی نگاہیں مخمور

دل کو تسخیر کرے انجمن آرا ہو کر

ہو نہ دُنیا سے خفا دین کا پیارا ہو کر

گائے
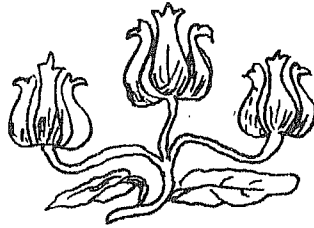
سنہ ۱۹۱۲ء

تو وہ مخلوق ہے خلقت میں نہیں جس کی گناہ　　لی ہے قالب میں ترے روح محبت نے پناہ
تیری صورت سے عیاں ہوتی ہے انسان کی چاہ　　رس بھری آنکھ سموئی ہوئی امرت میں نگاہ

نقش ہے دل پہ مرے موہنی صورت تیری
خوب دنیا کے شوالے میں ہے مورت تیری

تن سے تیرے ہے عیاں نرمیِ دل کا جوہر　　جوڑ بند ایسے کہ سانچے میں بنے ہیں ڈھل کر
رنگ کالا ہو کہ اجلا ہو کہیں ہے نظر　　بندرابن کی وہ ہے شام یہ متھرا کی سحر

گنگرے سے یہ نہیں چہرۂ نورانی پر
تاج قدرت نے سجا ہے تری پیشانی پر

دیکھے جنگل میں کوئی شام کو تیری رفتار　　بے پیئے جیسے کسی کو ہو جوانی کا خمار
مست کر دیتی ہے شاید تجھے قدرت کی بہار　　وہ اترتی ہوئی دھوپ اور وہ سبزے کا نکھار

ایک ایک گام پہ شوخی سے مچلنا تیرا
کھا کے جنگل کی ہوا جھوم کے چلنا تیرا

صاحبِ دل تجھے تصویرِ وفا کہتے ہیں　　چشمۂ فیضِ خدا مردِ خدا کہتے ہیں
دردمندوں کی مسیحا شعرا کہتے ہیں　　ماں تجھے کہتے ہیں ہندو تو بجا کہتے ہیں

کون ہے جس نے تیرے دودھ سے منہ پھیرا ہے
آج اس قوم کی رگ رگ میں لہو تیرا ہے

نام جس کا ہے محبت وہ ہے ایماں تیرا　　کوئی ہو سب کے لئے فیض ہے یکساں تیرا
زندگی کے لئے محتاج ہے انساں تیرا　　کون بیمار نہیں بندۂ احساں تیرا

حلق میں دودھ سے تیرے جو تری رہتی ہے
خشک ٹہنی تنِ لاغر کی ہری رہتی ہے

صورتیں یاد ہیں اُن بچوں کی پیاری پیاری　　زندگی کی جنھیں ایک ایک گھڑی تھی بھاری
تیرے دم سے نہ رہی یاس کی حالت طاری　　ہو گئیں اُن کے لئے دودھ کی نہریں جاری

کتنے گرتے ہوئے پودوں کو سنبھالا تو نے
ماں جنھیں چھوڑ چلی تھی اُنھیں پالا تو نے

تیرے بچوں نے کیا اپنے تئیں ہم پہ نثار　　اپنی گردن پہ لیا پرورشِ قوم کا بار
نظر آتی ہے جو ہر فصل میں کھیتی تیار　　ہے یہ سب اُن کے لہو اور پسینے کی بہار

اُن کو منظور نہ ہوتا جو مٹانا اپنا
ہند کی خاک اُگلتی نہ خزانہ اپنا

اہلِ دیں نے تجھے جنت کا سہارا سمجھا — اپنے ایمان کی قسمت کا ستارا سمجھا

سورپیروں نے تجھے جان سے پیارا سمجھا — تجھ کو اکبر نے سدا آنکھ کا تارا سمجھا

آبرو قوم کی ہے تیری نگہبانی پر

یہی دو حرف لکھے ہیں تری پیشانی پر

مثل بچوں کے ترے دودھ کے ہیں متوالے — جو ضعیفی سے پڑے رہتے ہیں بستر ڈالے

مست رہتے ہیں ترے فیض سے کس بل والے — پیار سے کہتے ہیں "ماتا" تجھے بچے پالے

تیری اُلفت سے انھیں مُنہ نہیں موڑا جاتا

تیری صورت کا کھلونا نہیں توڑا جاتا

میرے دل میں ہے محبت کا تری سرمایا — ماں کے دامن سے ہے بڑھ کر مجھے تیرا سایا

یاد ہے فیض طبیعت نے جو تجھ سے پایا — عین قسمت جو ترا نام زباں پر آیا

اس حلاوت سے جو دعوائے سخنگوئی ہے

دودھ سے تیرے لڑکپن میں نہال ہوئی ہے

قومی مسدّس

(نظم متعلق ہندو یونیورسٹی)

سنہ ۱۹۱۱ء

الٰہی کون فرشتے ہیں یہ گدائے وطن
صفائے قلب سے جن کے یہ بزم ہے روشن
جُھکی ہوئی ہے سبھوں کی لحاظ سے گردن
ہر اک زباں پہ ہیں تعظیم اور ادب کے سخن
صفیں کھڑی ہیں جوانوں کی اور پیروں کی
خُدا کی شان یہ پھیری ہے کن فقیروں کی

فقیر علم کے ہیں ان کی داستاں سُن لو
پیام قوم کا دُکھ درد کا بیاں سُن لو
یہ دن وہ دن ہے جو ہے یادگار ہاں سُن لو
ہے آج غیرتِ قومی کا امتحاں سُن لو
یہی ہے وقت امیروں کی پیشوائی کا
فقیر آئے ہیں کاسہ لئے گدائی کا

جو اپنے واسطے مانگیں یہ وہ فقیر نہیں
طمع میں دولتِ دُنیا کی یہ اسیر نہیں
امیر دل کے ہیں ظاہر کے یہ امیر نہیں
وہ آدمی نہیں ان کا جو دستگیر نہیں
تمام دولتِ ذاتی لُٹائے بیٹھے ہیں
تمھارے واسطے دھونی رمائے بیٹھے ہیں

ع یہ نظم بتاریخ ۳ ستمبر سنہ ۱۹۱۱ء لکھنؤ میں ہندو یونیورسٹی کے عظیم الشان جلسہ میں پڑھی گئی تھی۔ اس جلسہ میں پنڈت مدن موہن مالوی صاحب اور دیگر حضرات یونیورسٹی کے لئے چندہ جمع کرنے کے لئے تشریف لائے تھے۔

سوال ان کا ہے تعلیم کا بنے مندر   کلس ہو جس کا ہمالہ سے اوج میں برتر
اسی امید پہ یہ گھومتے ہیں شام و سحر   صدا لگاتے ہیں راہ خدا میں یہ کہہ کر

وہ خود غرض ہیں جو دولت پہ جان دیتے ہیں
وہی ہیں مرد جو وِدیا کا دان دیتے ہیں

سوال رد نہ ہو ان کا یہ شرط ہے تدبیر   اسی سے پائیں گے ایمان و آبرو توقیر
یہ ہے ترقی قومی کے واسطے اکسیر   بہے علوم کی گنگا پئیں غریب و امیر

وقار قوم بڑھے دور بے زری ہو جائے
اجڑ گئی ہے جو کھیتی وہ پھر ہری ہو جائے

جو ہو رہا ہے زمانہ میں ہے تمھیں معلوم   کہ ہو گئے ہیں گراں کس قدر فنون و علوم
تمھاری قوم سے دولت ہوئی ہے یوں معدوم   کہ اب ترستے ہیں پڑھنے کو سیکڑوں معصوم

وہ خود ترستے ہیں ماں باپ اُن کے روتے ہیں
تمھاری قوم کے بچے تباہ ہوتے ہیں

یہ بے گناہ اُسی قوم کے ہیں لخت جگر   کہ جس نے تم کو بھی پالا ہے صورت مادر
جگر پہ قوم کے افلاس کا چلے خنجر   غضب خدا کا تمھارے دلوں پہ ہو نہ اثر

اُسی سے بے خبری جس کے دم سے جیتے ہو
اُسے رُلاتے ہو جس ماں کا دودھ پیتے ہو

یہ قحط کیا ہے۔ یہ طاعون کیا ہے۔ کیا ہے وبا تمھاری قوم پہ نازل ہوا ہے قہر خدا
جو راہ راست سے ہوتی ہے کوئی قوم جدا اسی طرح اُسے ملتی ہے ایک روز سزا

اسی طرح سے ہوا قوم کی بگڑتی ہے
اسی طرح سے غریبوں کی آہ پڑتی ہے

گناہ قوم کے دھو جائیں اب وہ کام کرو مٹے کلنک کا ٹیکا وہ فیض عام کرو
نفاق و جہل کو بس دور سے سلام کرو کچھ اپنی قوم کے بچوں کا انتظام کرو

یہ کام ہو کے رہے چاہے جاں رہے نہ رہے
زمیں رہے نہ رہے آسماں رہے نہ رہے

یہ کار خیر میں کوشش یہ قوم کا دربار لگا دو آج تو چاندی کے ہر طرف انبار
یہ سب کہیں کہ ہے زندہ یہ قوم غیرت دار ہے اس کے دل میں بزرگوں کی آبرو کا وقار

سروں میں حُبِّ وطن کا جنون باقی ہے
رگوں میں بھیشم و ارجن کا خون باقی ہے

مسنر بسنٹ کے احسان کی تمھیں ہے خبر کیا نثار بڑھا پا تمھارے بچوں پر
شریک وہ بھی ہیں اس کار خیر کے اندر نہ اُن کی آنکھ ہو نیچی رہے یہ مدنظر

مٹے نہ بات کہیں تم پہ مٹنے والوں کی
تمھارے ہاتھ ہے شرم ان سفید بالوں کی

تمھارے واسطے لازم ہے مالوی[1] کا بھی پاس　　کہ جس کی ذات سے اٹکی ہوئی ہے قوم کی آس

لیا غریب نے گھر بار چھوڑ کر بن باس　　جو یہ نہیں ہے تو کہتے ہیں پھر کسے سنیاس

تمام عمر کٹی ایک ہی قرینے پر

گرایا اپنا لہو قوم کے پسینے پر

اسی کے ہاتھ میں ہے قوم کا سنور جانا　　تمھاری ڈوبتی کشتی کا پھر اُبھر جانا

جو تم نے اب بھی نہ دُنیا میں کام کر جانا　　تو یہ سمجھ لو کہ بہتر ہے اس سے مر جانا

غضب ہوا جو دل اس کا بھی تم سے اوب گیا

گر اس آنکھ سے آنسو تو نام ڈوب گیا

گھٹائیں جہل کی چھائی ہوئی ہیں تیرہ و تار　　یہ آرزو ہے کہ تعلیم سے ہو بیڑا پار

مگر جو خواب سے اب بھی نہ تم ہوے بیدار　　تو جان لو کہ ہے اس قوم کی چتا تیار

مٹے گا دین بھی اور آبرو بھی جائے گی

تمھارے نام سے دُنیا کو شرم آئے گی

جو اس طرح ہوا دُنیا میں آبرو کا زوال　　تو کام آئے گا عقبیٰ میں کیا یہ دولت و مال

کرو خدا کے لئے کچھ مرے ہوؤں کا خیال　　نہ ہوں تمھارے بزرگوں کی ہڈیاں پامال

یہ آبرو تو ہزاروں برس میں پائی ہے

نہ یوں لٹاؤ کہ رشیوں کی یہ کمائی ہے

---

[1] پنڈت مدن موہن مالوی صاحب۔

لٹاؤ نام پہ دولت اگر ہو غیرت دار — پکار اُٹھے یہ زمانہ کہ ہے یہ پر اُپکار

ہے زور ہمتِ مردانہ قوم کو درکار — ورق اُلٹ دو زمانہ کا مل کے سب اک بار

اگر ہو مرد نہ یوں عمر رائیگاں کاٹو

غریب قوم کے پیروں کی بیڑیاں کاٹو

یہ کارِ خیر وہ ہو ۔ نام چار سو رہ جائے — تمھاری بات زمانہ کے روبرو رہ جائے

جو غیر ہیں اُنھیں جھینپنے کی آرزو رہ جائے — غریب قوم کی دُنیا میں آبرو رہ جائے

ذرا حمیت و غیرت کا حق ادا کر دو

فقیر قوم کے آئے ہیں جھولیاں بھر دو

یہاں سے جائیں تو جائیں یہ جھولیاں بھر کر — لٹائیں علم کی دولت تمھارے بچوں پر

اِدھر یہ ناز ہو تم کو کہ خوش گئے یہ بشر — جو ہو سکا وہ کیا نذران کی ٹیک کے سر

یہی ہو فخر جوانوں کا اور پیروں کا

سوال رد نہ کیا قوم کے فقیروں کا

رامائن کا ایک سین

(راجہ رامچندر کا ماں سے رخصت ہونا)

رخصت ہوا وہ باپ سے لیکر خدا کا نام — راہِ وفا کی منزلِ اوّل ہوئی تمام
منظور تھا جو ماں کی زیارت کا انتظام — دامن سے اشک پوچھ کے دل سے کیا کلام

اظہارِ بیکسی سے ستم ہوگا اور بھی
دیکھا ہمیں اداس تو غم ہوگا اور بھی

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نونہال — خاموش ماں کے پاس گیا صورتِ خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال — سکتا سا ہوگیا ہے یہ ہے شدّتِ ملال

تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویر سنگ ہے۔

کیا جانے کس خیال میں گم تھی وہ بےگناہ — نورِ نظر پہ دیدۂ حسرت سے کی نگاہ
جنبش ہوئی لبوں کو بھری ایک سرد آہ — لی گوشہ ہائے چشم سے اشکوں نے رخ کی راہ

چہرے کا رنگ حالتِ دل کھولنے لگا
ہر موئے تن زباں کی طرح بولنے لگا

آخر اسیرِ یاس کا قفلِ دہن کھلا — افسانۂ شدائدِ رنج و محن کھلا
اک دفترِ مظالمِ چرخِ کہن کھلا — وا تھا دہانِ زخم کہ بابِ سخن کھلا

دردِ دلِ غریب جو صرفِ بیاں ہوا
خونِ جگر کا رنگ سخن سے عیاں ہوا

رو کر کہا خموش کھڑے کیوں ہو میری جاں   میں جانتی ہوں جس لئے آئے ہو تُم یہاں
سب کی خوشی یہی ہے تو صحرا کو ہو رواں   لیکن میں اپنے مُنہ سے نہ ہرگز کہوں گی ہاں

کِس طرح بَن میں آنکھوں کے تارے کو بھیج دوں
جوگی بنا کے راج دُلارے کو بھیج دوں

دُنیا کا ہو گیا ہے یہ کیسا لہو سپید   اندھا کئے ہوئے ہے زر و مال کی اُمید
انجام کیا ہو کوئی نہیں جانتا یہ بھید   سوچے بشر تو جسم ہو لرزاں مثالِ بید

لکھی ہے کیا حیاتِ اَبد ان کے واسطے
پھیلا رہے ہیں جال یہ کِس دن کے واسطے

لیتی کسی فقیر کے گھر میں اگر جنم   ہوتے نہ میری جان کو سامان یہ بہم
ڈستا نہ سانپ بَن کے مجھے شوکت و حشم   تُم میرے لال تھے مجھے کس سلطنت سے کم

مَیں خوش ہوں پھونک دے کوئی اس تخت و تاج کو
تُم ہی نہیں تو آگ لگاؤں گی راج کو

۱؎ بھرت جی کی ماں کیکئی کی طرف اشارہ ہے جن کی ضد سے مجبور ہو کر راجہ دسرت نے رامچندر جی کو بن باس کا حکم دیا تھا اور بھرت جی کو اپنا ولی عہد مقرر کیا تھا۔

گن گن کے یا ضتوں سے گذارے ہیں ماہ و سال　　دیکھی تمھاری شکل جب اے میرے نونہال
پورا ہوا جو بیاہ کا ارمان تھا کمال　　آفت یہ آئی مجھ پہ ہوئے جب سفید بال
چھٹتی ہوں اُن سے جوگ لیا جن کے واسطے
کیا سب کیا تھا میں نے اسی دن کے واسطے

ایسے بھی نامُراد بہت آئیں گے نظر　　گھر جن کے بے چراغ رہے آہ عمر بھر
رہتا مرا بھی نخل تمنّا جو بے ثمر　　یہ جائے صبر تھی کہ دُعا میں نہیں اثر
لیکن یہاں تو بن کے مقدر بگڑ گیا
پھل پھول لا کے باغ تمنّا اُجڑ گیا

سرزد ہوئے تھے مجھ سے خدا جانے کیا گناہ　　منجھدار میں جو یوں مری کشتی ہوئی تباہ
آتی نظر نہیں کوئی امن و اماں کی راہ　　اب یاں سے کوچ ہو تو عدم میں ملے پناہ
تقصیر میری خالق عالم بحل کرے
آسان مجھ غریب کی مشکل اجل کرے

سُن کر زباں سے ماں کی یہ فریاد درد خیز　　اُس خستہ جاں کے دل پہ چلی غم کی تیغ تیز
عالم یہ تھا قریب کہ آنکھیں ہوں اشک ریز　　لیکن ہزار ضبط سے رونے سے کی گریز
سوچا یہی کہ جان سے بیکس گذر نہ جائے
ناشاد ہم کو دیکھ کے ماں اور مر نہ جائے

پھر عرض کی یہ مادرِ ناشاد کے حضور — مایوس کیوں ہیں آپ الم کا ہے کیوں وفور
صدمہ یہ شاق عالمِ پیری میں ہے ضرور — لیکن نہ دل سے کیجئے صبر و قرار دور
شاید خزاں سے شکلِ عیاں ہو بہار کی
کچھ مصلحت اسی میں ہو پروردگار کی

یہ جعل یہ فریب یہ سازش یہ شور و شر — ہونا جو ہے سب اُس کے بہانے ہیں سربسر
اسباب ظاہری ہیں نہ ان پر کرو نظر — کیا جانے کیا ہے پردۂ قدرت میں جلوہ گر
خاص اُس کی مصلحت کوئی پہچانتا نہیں
منظور کیا اُسے ہے کوئی جانتا نہیں

راحت ہو یا کہ رنج خوشی ہو کہ انتشار — واجب ہر ایک رنگ میں ہے شکرِ کردگار
تم ہی نہیں ہو کشتۂ نیرنگِ روزگار — ماتم کدہ میں دہر کے لاکھوں ہیں سوگوار
سختی سہی نہیں کہ اُٹھائی کڑی نہیں
دُنیا میں کیا کسی پہ مصیبت پڑی نہیں

دیکھے ہیں اس سے بڑھ کے زمانے نے انقلاب — جن سے کہ بے گناہوں کی عمریں ہوئیں خراب
سوزِ دروں سے قلب و جگر ہو گئے کباب — پیری مٹی کسی کی کسی کا مٹا شباب
کچھ بن نہیں پڑا جو نصیبے بگڑ گئے
وہ بجلیاں گریں کہ بھرے گھر اُجڑ گئے

ماں باپ مُنہ ہی دیکھتے تھے جن کا ہر گھڑی قائم تھیں جن کے دم سے اُمیدیں بڑی بڑی
دامن پہ جن کے گرد بھی اُڑ کر نہیں پڑی ماری نہ جن کو خواب میں بھی پھول کی چھڑی

محروم جب وہ گُل ہوئے رنگِ حیات سے
اُن کو جلا کے خاک کیا اپنے ہات سے

کہتے تھے لوگ دیکھ کے ماں باپ کا ملال اِن بیکسوں کی جان کا بچنا ہے اب محال
ہے کبریا کی شان گذرتے ہی ماہ و سال خود دِل سے دردِ ہجر کا مٹتا گیا خیال

ہاں کچھ دنوں تو نوحہ و ماتم ہوا کیا
آخر کو روکے بیٹھ رہے اور کیا کیا

پڑتا ہے جس غریب پہ رنج و محن کا بار کرتا ہے اُس کو صبر عطا آپ کردگار
مایوس ہو کے ہوتے ہیں انساں گُناہ گار یہ جانتے نہیں وہ ہے دانائے روزگار

انسان اُس کی راہ میں ثابت قدم رہے
گردن وہی ہے امرِ رضا میں جو خم رہے

اور آپ کو تو کچھ بھی نہیں رنج کا مقام بعدِ سفر وطن میں ہم آئیں گے شاد کام
ہوتے ہیں بات کرتے میں چودہ برس تمام قائم اُمید ہی سے ہے دُنیا ہے جس کا نام

اور یوں کہیں بھی رنج و بلا سے مفر نہیں
کیا ہوگا دو گھڑی میں کسی کو خبر نہیں

اکثر ریاض کرتے ہیں پھولوں پہ باغباں
ہے دن کی دھوپ رات کی شبنم انھیں گراں

لیکن جو رنگ باغ بدلتا ہے ناگہاں
وہ گُل ہزار پردوں میں جاتے ہیں رائگاں

رکھتے ہیں جو عزیز انھیں اپنی جاں کی طرح
مَلتے ہیں دستِ یاس وہ برگِ خزاں کی طرح

لیکن جو پھول کھِلتے ہیں صحرا میں بے شمار
موقوف کچھ ریاض پہ اُن کی نہیں بہار

دیکھو یہ قدرتِ چمن آرائے روزگار
وہ ابر و باد و برف میں رہتے ہیں برقرار

ہوتا ہے اُن پہ فضل جو ربِّ کریم کا
موجِ سموم بنتی ہے جھونکا نسیم کا

اپنی نگاہ ہے کرمِ کارساز پر
صحرا چمن بنے گا وہ ہے مہرباں اگر

جنگل ہو یا پہاڑ سفر ہو کہ ہو حَضر
رہتا نہیں وہ حال سے بندے کے بیخبر

اُس کا کرم شریک اگر ہے تو غم نہیں
دامانِ دشت دامنِ مادر سے کم نہیں

ماں کا جواب

یہ گفتگو ذرا نہ ہوئی ماں پہ کارگر
ہنس کر و فورِ یاس سے لڑکے پہ کی نظر

چہرہ پہ یوں ہنسی کا نُمایاں ہوا اثر
جس طرح چاندنی کا ہو^١ شمشان میں گُذر

١: مرگھٹ۔

پنہاں جو بیکسی تھی وہ چہرہ پہ چھا گئی
جو دل کی مُردنی تھی نگاہوں میں آگئی

پھر یہ کہا کہ میں نے سُنی سب یہ داستان — لاکھوں برس کی عمر ہو بیٹے ہو ماں کو گیان[1]
لیکن جو میرے دل کو ہے درپیش امتحان — بچے ہو اس کا علم نہیں تم کو بے گمان

اِس درد کا شریک تمھارا جگر نہیں
کچھ مامتا[2] کی آنچ کی تُم کو خبر نہیں

آخر ہے عمر۔ ہے یہ مرا وقت واپسیں — کیا اعتبار آج ہوں دُنیا میں کل نہیں
لیکن وہ دن بھی آئے گا اس دل کو ہے یقیں — سوچو گے جب کہ روتی تھی کیوں مادرِ حزیں

اولاد جب کبھی تمھیں صورت دکھائے گی
فریاد اس غریب کی تب یاد آئے گی

اِن آنسوؤں کی قدر تمھیں کچھ ابھی نہیں — باتوں سے جو بجھے یہ وہ دل کی لگی نہیں
لیکن تمھیں ہو رنج یہ میری خوشی نہیں — جاؤ سدھارو خوش رہو میں روکتی نہیں

دُنیا میں بیحیائی سے زندہ رہوں گی میں
پالا ہے میں نے تم کو تو دُکھ بھی سہوں گی میں

نشتر تھے رام کے لئے یہ حرفِ آرزو — دل ہل گیا سرکنے لگا جسم سے لہو

۱۔ علم الٰہی کا سبق۔ ۲۔ ماں کی محبت کا قدرتی جذبہ۔

سمجھے جو ماں کے دین کو ایمان و آبرو سُننی پڑے اُسے یہ خجالت کی گفتگو
کچھ بھی جواب بن نہ پڑا فکر و غور سے
قدموں پہ ماں کے گر پڑا آنسو کے طور سے
طوفان آنسوؤں کا زباں سے ہوا نہ بند رُک رُک کے اس طرح ہوا گویا وہ دردمند
پہونچی ہے مجھ سے آپ کے دل کو اگر گزند مرنا مجھے قبول ہے جینا نہیں پسند
جو بے وفا ہے مادرِ ناشاد کے لئے
دوزخ یہ زندگی ہے اُس اولاد کے لئے
ہے دور اس غلام سے خودرائی کا خیال ایسا گمان بھی ہو یہ میری نہیں مجال
گر سو برس بھی عمر کو میری نہ ہو زوال جو دین آپ کا ہے ادا ہو یہ ہے محال
جاتا کہیں نہ چھوڑ کے قدموں کو آپ کے
مجبور کر دیا مجھے وعدہ نے باپ کے
آرام زندگی کا دکھاتا ہے سبز باغ لیکن بہارِ عیش کا مجھ کو نہیں دماغ
کہتے ہیں جس کو دھرم وہ دُنیا کا ہے چراغ ہٹ جاؤں اس روش سے تو کل[1] میں لگے گا داغ
بے آبرو یہ جنس[2] نہ ہو یہ ہراس ہے
جس گود میں پلا ہوں مجھے اس کا پاس ہے

---

[1] خاندان ۔ [2] قوم ۔

بن باس پر خوشی سے جو راضی نہ ہوں گا میں   کِس طرح مُنہ دکھانے کے قابل رہوں گا میں

کیوں کر زبان غیر کے طعنے سنوں گا میں   دُنیا جو یہ کہے گی تو پھر کیا کروں گا میں

لڑکے نے بیحیائی کو نقشِ جبیں کیا

کیا بے ادب تھا باپ کا کہنا نہیں کیا

تاثیر کا طلسم تھا معصوم کا خطاب   خود ماں کے دل کو چوٹ لگی سُن کے یہ جواب

غم کی گھٹا سے ہٹ گئی تاریکیِ عتاب   چھاتی بھر آئی ضبط کی باقی رہی نہ تاب

سرکا کے پاؤں گود میں سر کو اُٹھا لیا

سینہ سے اپنے لختِ جگر کو لگا لیا

دونوں کے دل بھر آئے ہوا اور ہی سماں   گنگ و جمن کی طرح سے آنسو ہوئے رواں

ہر آنکھ کو نصیب یہ اشکِ وفا کہاں   ان آنسوؤں کا مول اگر ہے تو نقدِ جاں

ہوتی ہے اِن کی قدر فقط دل کے راج میں

ایسا گُہر نہ تھا کوئی دسرتؔ کے تاج میں[۲]

۱۔ جلا وطنی۔ ۲۔ راجہ دسرت راجہ رامچندر کے والد۔

سیر دیرہ دون

۱۹۱۶ء

یہیں بہار کا پہلے پہل ہوا تھا شگوں — عجیب خطۂ دلکش ہے شہر دیرہ دون

نگاہِ شوق نے کیا کہیے کیا سماں دیکھا — نئی زمین نیا رنگِ آسماں دیکھا

سُنا جو کرتے تھے وہ باغ پُر فضا ہے یہی — اگر پہاڑ میں جنّت تو راستہ ہے یہی

ازل میں تھی جو فضا اُس کا یادگار ہے یہ — نشیب کوہ میں گہوارۂ بہار ہے یہ

کیا نہیں اسے غارت بشر کی صنعت نے — یہ سبزہ زار سجایا ہے دستِ قدرت نے

سپرد ابر کے ہے انتظام پانی کا — ہوا سے سرو کو ہے حکم باغبانی کا

تمام شہر ہے گرد و غبار سے خالی — جدھر نگاہ اُٹھے اس طرف ہے ہریالی

لباس پہنے ہیں کُل خشت و سنگ سبزہ کا — بجائے خاک کے اُڑتا ہے رنگ سبزہ کا

اثر خزاں کا ہو کیا تازگی کے مسکن میں — پہاڑ اس کو چھپائے ہیں اپنے دامن میں

گھنے درخت ہری جھاڑیاں زمیں شاداب — لطیف و سرد ہوا پاک و صاف چشمۂ آب

کمی کبھی نہیں شادابیوں کے ساماں میں — ٹھہر گئی ہے بہار آ کے اس گلستاں میں

طلسم حُسن کا ہے بیچ میں یہ گلدستہ — کھڑے ہیں کوہ و شجر پہلوؤں میں صف بستہ

یہاں جو آ کے مسافر مقام کرتے ہیں — یہ سنتری اُنھیں پہلے سلام کرتے ہیں

جو دور جائیے بستی سے اور ہی ہے سماں / یہ سوچتا ہے پہاڑوں کو دیکھ کر انساں

بشر پہ رعب یہ قدرت کا چھا گیا کیسا / یہ بل زمین کی تیوری پہ آ گیا کیسا

بلندیوں سے جو ہو مائلِ نشیب نظر / فریب دیتا ہے ندی کا پیچ و خم اکثر

نگہ کو دور سے پانی ہے جو نظر آتا / سپید ناگ چلا جا رہا ہے بل کھاتا

قریب ہوتا ہے آخر یہ دور کا عالم / نگاہ دیکھتی ہے پھر سرور کا عالم

فضائے کوہ میں ایسی ہوا سماتی ہے / بشر کی روح کو راحت کی نیند آتی ہے

بس ایک عالمِ ہُو چار سمت طاری ہے / نہ شور و شر ہے نہ دُنیا کی آہ و زاری ہے

اثر دکھاتا ہے قدرت کا نغمۂ دل گیر / شجر حجر سے ٹپکتی ہے راگ کی تاثیر

یہ راگ وہ ہے جو مضراب کا اسیر نہیں / یہ صرف کان کے پردوں میں گوشہ گیر نہیں

وہی سُنے گا اسے دل گداز ہے جس کا / ہو دل میں سوز تو رگ رگ میں ساز ہے اس کا

یہ راگ مجھ میں سمایا سرور سے ہو کر / ہوس تھی روح کو مل جائے اس میں لے ہو کر

حریم خاص میں قدرت کی باریابی تھی / نگاہِ شوق میں اک شان بے حجابی تھی

نشست سنگ پہ تھی سایۂ شجر کے تلے / رواں تھا چشمۂ آبِ خنک نظر کے تلے

شریک حال تھی وضعِ قدیم قدرت کی / عیاں تھی سنگ و شجر سے کشش محبت کی

شراب اُنس حقیقی سے تھا ہر اک سرشار / شجر تھا کوہ تھا چشمہ تھا یا یہ مشت غبار

درخت و کوہ ہیں کیا ذات پاک انسان کیا / طیور کیا ہیں ہوا کیا ہے ابر و باراں کیا

یہ موجِ ہستیِ بیدار کے عناصر ہیں — سب ایک قافلۂ شوق کے مسافر ہیں
یہ دل کے ٹکڑے ہیں قدرت کے ان میں بیر نہیں — سب ایک گود کے پالے ہیں کوئی غیر نہیں
انھیں سے نغمۂ قدرت ہے اوج و پستی میں — سب ایک ساز کے پردے ہیں بزمِ ہستی میں
جُدا کسی سے بھی ہستی کا اپنی راز نہیں — کچھ آبشار میں اور ہم میں امتیاز نہیں
ہے جسمِ خاک یہاں اُس کا جسم پانی ہے — جو روح ہم میں ہے اُس میں وہی روانی ہے
اسی خیال میں طبعِ لطیف تھی سرشار — کچھ ایسی بے خبری تھی کہ ہوش اُس پہ نثار
دل اپنے رنگ میں بیتاب تھا اس ارماں سے — کہ اس فضا میں ہو آزاد روح زنداں سے
اجل جو آئے تو اس کوہسار کے نیچے — بنے مزار کسی آبشار کے نیچے

غرض کہ روح کی آنکھوں سے یہ سماں دیکھا — ازل کے دن جو چھٹا تھا وہ آشیاں دیکھا
نیا سرور میسّر ہوا سفر کر کے — مگر نہ سیرِ چمن کر سکے نظر بھر کے
نصیب دل کو رہا ایسے میزباں[1] سے نیاز — کہ جس کی ذات پہ ہے خاکِ دیرہ دوں کو ناز

وہ ذات کیا ہے کہ تصویر ہے حمیّت کی
اُسی سے شرح ہوئی لفظ آدمیت کی

---

[1] پنڈت آنند نراین تنخواہ دار۔ وکیل دیرہ دون۔

آصف الدولہ کا امام باڑہ (لکھنؤ)

آصف الدولہؒ مرحوم کی تعمیر کہن — جس کی صنعت کا نہیں صفحۂ ہستی پہ جواب
دیکھ سیاح اسے رات کے سناٹے میں — مُنہ سے اپنے مہِ کامل نے جب اُلٹی ہو نقاب
درو دیوار نظر آتے ہیں کیا صاف و سبک — سحر کرتی ہے نگاہوں پہ ضیائے مہتاب
یہی ہوتا ہے گُماں خاک سے مس اس کو نہیں — ہے سنبھالے ہوئے دامن میں ہوائے شاداب
یک بہ یک دیدۂ حیراں کو یہ شک ہوتا ہے — ڈھل کے سانچے میں زمیں پر اُتر آیا ہے سحاب
بیخودی کہتی ہے آیا یہ فضا میں کیوں کر — کسی اُستاد مصوّر کا ہے یہ جلوۂ خواب

اِک عجب منظرِ دلگیر نظر آتا ہے
دُور سے عالمِ تصویر نظر آتا ہے

شوکت و شان عمارت کی خبر دیتا ہے — پردۂ شب کے سرکنے پہ سحر کا آغاز
وہ سپیدی سحر نُور کی ہلکی ہلکی — آشیاں چھوڑ کے جب کرتے ہیں طائر پرواز
ایسے عالم میں وہ کہرے سے اُبھرنا اُس کا — جیسے موجوں کے تلاطم سے نُمایاں ہو جہاز
ہوتے ہیں گنبد و مینار فضا میں ظاہر — بڑھ کے ہوتی ہیں زیارت سے نگاہیں ممتاز
جگمگاتا ہے شعاعوں میں یہ ایوان بلند — جس کی صنعت کا ہے دُنیا میں نرالا انداز
پارۂ چوب کے احساں کی ضرورت نہ رہی — خاک اور خشت نے مِل کر یہ دکھایا اعجاز

اس کی تعمیر کو آئے نہیں معمار فرنگ — ہے یہ تہذیب اودھ کے لئے سرمایۂ ناز
بچ گیا خاک کے پردہ پہ یہ مٹی کا طلسم — گو زمانہ کی ہوا اس کے لئے تھی ناساز
اس کے سایہ میں گرا تاج حکومت سر سے — اس نے دیکھا یہ زمانہ کا نشیب اور فراز
مل گئے خاک میں سب اس کے بسانے والے — کچھ شجرہائے کہن اب ہیں پرانے دمساز
کیا سرِ شام اُداسی کا سماں رہتا ہے — در و دیوار سے کر جاتی ہے رونق پرواز
دھوپ اُترتی ہوئی آنکھوں کو یہ دکھلاتی ہے — دلِ مجروح کا ہر خشت میں ہے سوز و گداز
جس کے فیضانِ حکومت کا کرشمہ ہے یہ — اس کے سایہ میں ہے سویا ہوا وہ خلق نواز
اُس کی ہمت کی بلندی ہے بلندی اس کی — اُس کے اخلاق کے وسعت کا ہے اس میں انداز
جب زیارت میں محرم کو بشر آتے ہیں — چاندنی رات میں آتی ہے فلک سے آواز

بے ادب پا منہ اینجا کہ عجب درگاہ است
سجدہ گاہِ ملک و روضۂ شاہنشاہ است

معذرت

سنہ۱۹۱۷ء

کیا کہوں آج کی تقریب سے کس طرح ہوں دور
اپنی حالت میں گرفتار ہوں اور ہوں مجبور

ہاں مگر ایسی جُدائی مجھے منظور نہیں
آنکھ سے دور ہوں میں دل سے ذرا دور نہیں

سیر کو آئے ہو جس باغ میں تُم وقت سحر
روح میری بھی ہے مہمان وہیں بُو ہو کر

مَیں یہاں دل ہے وہاں جسم یہاں جان وہاں
پھر رہا ہے نگہِ شوق میں شادی کا سماں

پھول چاندی کے لُٹاتے ہوئے آئی ہے رات
اپنے دِلسوز کی قُدرت نے سجائی ہے برات

بوئے گُل سامنے حاضر ہے لئے عطرِ عروس
روشنی چاند کی ہے اور ہے پھولوں کا جلوس

نونہالانِ چمن عیش کی تصویریں ہیں
پھول پتوں سے عیاں راگ کی تاثیریں ہیں

راگ قدرت کا ہے یہ ساز کا محتاج نہیں
ساز کیا شے ہے یہ آواز کا محتاج نہیں

شام کو آج اُدھر سے جو ہوا آتی ہے
مجھ کو اس راگ کی رہ رہ کے صدا آتی ہے

جو خوشی تُم کو ہے وہ آبِ ہوا میں ہے بسی
لہر جمنا میں وہی ہے وہی پھولوں میں ہنسی

جوش اُسی کا ہے عیاں باغ کے فواروں میں
روشنی بن کے چمکتی ہے وہی تاروں میں

یہ لکیریں سی نہیں اس رخِ نورانی پر
ہے یہ ہنسنے کا اثر چاند کی پیشانی پر

سلہ متھرا میں ایک دوست کی شادی ہوئی تھی اُس میں شریک نہ ہو سکنے کی معذرت ہے۔

اُس محبّت کا ہے سینہ میں تمھارے مسکن
جس کے پرتو سے ہوئیں دل کی اُمنگیں روشن

چاندنی رات میں گنگا بھی چمکتی ہے یوں ہی
روشنی چاند کی لہروں میں جھلکتی ہے یوں ہی

جن کے اعمال میں مذہب کی لطافت نہیں خاک
اُن کے قدموں سے نہ یہ پاک ہوں نہ ناپاک

بس محبّت کے فرشتہ کی دُعا کافی ہے
آگ کے سامنے پیمانِ وفا کافی ہے

شوق کے پھول محبت کی ہوا میں کھل جائیں
جس طرح راگ سے لَے ملتی ہے دل یوں مل جائیں

ہوئے شوق سے جب آپ ہی قدرت سرشار
ہے تمھارے لئے دُنیا کی نمایش بے کار

تم نے کیوں باغ میں اک شاخ کو ویران کیا
مُفت میں توڑ کے پھولوں کو پریشان کیا

گو کہ ہنسنے کو یہ ہنستے ہیں مگر شاد نہیں
پھول سہرے کے گرفتار ہیں آزاد نہیں

باغ سے دُور دمِ صبح کھلا ہے اک پھول
کی چمنبند کی خدمت نہ کبھی جس نے قبول

رنگ میں اُس کے ہے میری ہی زباں کی تاثیر
بُو جو اُس میں ہے وہ ہے میری محبت کی سفیر

میری جانب سے وہ کرتا ہے محبت کا سلام
ہو مبارک تمھیں یہ جشن یہ دیتا ہے پیام

حصۂ سوم

(نوحہ جات)

بشن نرائن در

۱۹۱۶ء

صدمۂ عام یہ ہے قوم کا پیارا نہ رہا
بے زبانوں کی زباں دل کا سہارا نہ رہا

گلشنِ علم و ادب کا چمن آرا نہ رہا
مطلعِ دانش و بینش کا ستارا نہ رہا

سب یہ غم ایک طرف ایک طرف غم اپنا
جس سے دُنیا نہیں واقف وہ ہے ماتم اپنا

ہم نے دیکھے ہیں ترے اشکِ محبت اکثر
جن پہ صدقے ہیں زباں اور قلم کے جوہر

وہ نگینے تھے حمیت کے ترے قلب و جگر
ہوئی غیروں کو نہ اس پاک خزانے کی خبر

ظاہری حُسنِ لیاقت کے یہ دیوانے ہیں
شمع دیکھی نہیں فانوس کے پروانے ہیں

دولتِ علم و ہُنر سے نہیں دُنیا خالی — بزمِ عالم کی یہ رونق نہیں جانے والی
پر ہے کمیاب وہ جوہر وہ سرشتِ عالی — آدمیت کی بنا جس نے ازل میں ڈالی

کچھ بڑی بات نہیں فاضلِ دوراں ہونا
آدمی کے لئے معراج ہے انساں ہونا

آدمیت کی یہ تصویر مِٹی جاتی ہے — حُسنِ اخلاق کی تدبیر مٹی جاتی ہے
جذبۂ خیر کی توقیر مِٹی جاتی ہے — ہم مِٹے جاتے ہیں تقدیر مٹی جاتی ہے

دلِ مایوس محبت کا عزا خانہ ہے
اپنی آنکھوں میں یہ دُنیا نہیں ویرانہ ہے

ہے نظر میں تری ہستی کے ستارہ کا زوال — وہ شبِ غم کی سیاہی وہ مرض کا بھونچال
تب بھی سودائے وطن تھا ترے جینے کا مآل — خوف کہتے ہیں کسے موت کا آیا نہ خیال

کاہشِ تن سے طبیعت کی جلا کم نہ ہوئی
روشنی شمع کی گھُلنے سے ذرا کم نہ ہوئی

تجھ کو یوگی کہوں یا عالمِ بالا کا سفیر — تھا الگ اہلِ جہاں سے تری مٹی کا خمیر
آنچ دُنیائے دُنی کی جو رہی دامن گیر — کیا سبق روح کو لینا تھا یہاں رہ کے اسیر

کیا اسی طرح سے فطرت کی صفا ممکن تھی
کیا اسی آگ میں جلنے سے جلا ممکن تھی

روشِ عام سے تجھ کو نہ سروکار رہا — جوہرِ خاص کا ہستی سے طلبگار رہا
گو کہ جنجال میں دُنیا کے گرفتار رہا — اپنے دامن کو سمیٹے ہوئے ہُشیار رہا
رنگِ دُنیا سے رہا عالمِ فانی میں جُدا
جیسے لہروں سے کنول رہتا ہے پانی میں جُدا

تجھ کو معلوم نہ تھا دَولتِ دُنیا کیا ہے — حرص کیا شے ہے زر و مال کا سودا کیا ہے
خود پرستی کا زمانہ میں تقاضا کیا ہے — عیش کیا چیز ہے راحت کی تمنا کیا ہے
تُو نہ سمجھا کبھی غیروں کی مدد کے غم میں
اپنی راحت کا بھی سامان ہے اِس عالم میں

کارِ دُنیا میں گرفتار رہیں جو دُنیا دار — اُن کو دیکھا ہے تری بے خبری سے بیزار
تو کہاں اور کہاں اُن کی نظر کا معیار — پھول جو اُن کے لئے ہیں وہ تجھے تھے خس و خار
لُطف اِس بے خبری کا وہ اُٹھائیں کیوں کر
خاک میں لوٹتے ہیں عرش پہ جائیں کیوں کر

خلعتِ نُورِ طبیعت کو دیا قدرت نے — آبرو علم نے دی ظرف دیا غیرت نے
خود پسندی کو گوارا نہ کیا عادت نے — سات پردوں سے نکالا تجھے خود شہرت نے
تو مگر جوہرِ ذاتی کو دباتا ہی رہا
اپنے دامن میں چراغ اپنا چھپاتا ہی رہا

شہرۂ عام کو سمجھا نہ لیاقت کا صِلا　　نکتہ چینوں سے شکایت نہ رقیبوں سے گلا
دیدۂ غیر میں کھٹکی نہ طبیعت کی جِلا　　تو زمانہ سے مہِ نَو کی طرح جُھک کے مِلا

عاجزی دل کی جھلکتی رہی پیشانی سے
تو وہ دریا تھا جو واقف نہیں طغیانی سے

دل محبّت پہ فدا آنکھ مروّت سے غنی　　تجھ کو دشمن کی بھی منظور نہ تھی دل شکنی
مگر انصاف کے حق میں ہوا گر نیش زنی　　پھر نہ تھا تجھ سے زیادہ کوئی جرأت کا دھنی

شیر نر معرکۂ عام کی سرگرمی میں
طفلِ معصوم سے ملتا ہوا دل نرمی میں

آج کل مہر و فا میں ہے تجارت کی ادا　　کوئی بیکس کا نہیں دوست بجز ذات خُدا
یُوں ہوا کرتے ہیں یارانِ کہن دل سے جُدا　　جیسے پتّوں سے گرا دیتی ہے پانی کو ہوا

جس کا اقبال زمانہ میں چمک جاتا ہے
اُس کو بچپن کے رفیقوں سے حجاب آتا ہے

نہ ہوا فرق ترے رنگ محبّت میں عیاں　　دھوپ دولت کی رہی یا رہی افلاس کی چھاں
تیری خدمت سے ہوا احباب کی مشکل آساں　　دین تیرا تھا یہی اور یہی تیرا ایماں

ایک ہی وضع رہی ایک ہی انداز رہا
اپنے پیاروں کی غلامی پہ تجھے ناز رہا

بدنصیب ایسے بھی ہیں تجھ سے جو بیزار رہے
آ کے دُنیا میں فقط تیرے دل آزار رہے

ایسے بے درد زمانہ کے گُنہگار رہے
مگر احسان سے تیرے نہ سبکبار رہے

اُن کو شرمندہ کیا تو نے محبت کر کے
خود گُنہگار ہوئے تجھ سے عداوت کر کے

دل ہو تیرا سا تو دُنیا کی حقیقت کیا ہے
تن پرستی پہ جو ہو صرف وہ دولت کیا ہے

غیر کو جس سے نہ راحت ہو وہ راحت کیا ہے
جس میں سودا نہ ہو کچھ بھی وہ طبیعت کیا ہے

زندگی یوں تو فقط بازیٔ طفلانہ ہے
مرد وہ ہے جو کسی رنگ میں دیوانہ ہے
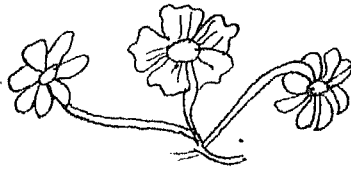
گوپال کرشن گوکھلے

سنہ ۱۹۱۵ء

لرز رہا تھا وطن جس خیال کے ڈر سے
وہ آج خون رلاتا ہے دیدۂ تر سے

صدا یہ آتی ہے پھل پھول اور پتھر سے
زمین پہ تاج گرا قوم ہند کے سر سے

حبیب قوم کا دنیا سے یوں روانہ ہوا
"زمیں الٹ گئی کیا منقلب زمانہ ہوا"

بڑھی ہوئی تھی نحوست زوالِ پیہم کی
ترے ظہور سے تقدیر قوم کی چمکی

نگاہِ یاس تھی ہندوستاں پہ عالم کی
عجیب شئے تھی مگر روشنی ترے دم کی

تجھی کو ملک میں روشن دماغ سمجھے تھے
تجھے غریب کے گھر کا چراغ سمجھے تھے

وطن کو تو نے سنوارا کس آب و تاب کے ساتھ
سحر کا نور بڑھے جیسے آفتاب کے ساتھ

چنے رفاہ کے گل حسن انتخاب کے ساتھ
شباب قوم کا چمکا ترے شباب کے ساتھ

جو آج نشو و نما کا نیا زمانہ ہے
یہ انقلاب تری عمر کا فسانہ ہے

رہا مزاج میں سودائے قوم خو ہو کر وطن کا عشق رہا دل کی آرزو ہو کر
بدن میں جان رہی وقف آبرو ہو کر رگوں میں جوش محبت رہے لہو ہو کر

خدا کے حکم سے جب آب و گلِ بنا تیرا
کسی شہید کی مٹی سے دل بنا تیرا

وطن کی جان پہ کیا کیا تباہیاں آئیں اُمنڈ اُمنڈ کے جہالت کی بدلیاں آئیں
چراغِ امن بجھانے کو آندھیاں آئیں دلوں میں آگ لگانے کو بجلیاں آئیں

اس انتشار میں جس نور کا سہارا تھا
اُفق پہ قوم کے وہ ایک ہی ستارا تھا

حدیثِ قوم بنی تھی تری زباں کے لئے زباں ملی تھی محبت کی داستاں کے لئے
خدا نے تجھ کو پیمبر کیا یہاں کے لئے کہ تیرے ہاتھ میں ناقوس تھا اذاں کے لئے

وطن کی خاک تری بارگاہ اعلےٰ ہے
ہمیں یہی نئی مسجد نیا شوالا ہے

غریب ہند نے تنہا نہیں یہ داغ سہا وطن سے دور بھی طوفان رنج و غم کا اُٹھا
حبیب کیا ہیں حریفوں نے یہ زباں سے کہا سفیر قوم جگر بند سلطنت نہ رہا

پیام شہ نے دیا رسمِ تعزیت کے لئے
کہ تو ستون تھا ایوانِ سلطنت کے لئے

دلوں میں نقش ہیں اب تک تری بلاغتِ سخن
ہماری راہ میں گویا چراغ ہیں روشن
فقیر تھے جو ترے در کے خادمانِ وطن
اُنھیں نصیب کہاں ہوگا اب ترا دامن

ترے الم میں وہ اس طرح جان کھوتے ہیں
کہ جیسے باپ سے چھُٹکر یتیم روتے ہیں

اجل کے دام میں آنا ہے یوں تو عالم کو
مگر یہ دل نہیں تیّار تیرے ماتم کو
پہاڑ کہتے ہیں دُنیا میں ایسے ہی غم کو
مٹا کے تجھ کو اجل نے مٹا دیا ہم کو

جنازہ ہند کا در سے ترے نکلتا ہے
سہاگ قوم کا تیری چتا میں جلتا ہے

رہے گا رنج زمانہ میں یادگار ترا
وہ کون دل ہے کہ جس میں نہیں مزار ترا
جو کل رقیب تھا ہے آج سوگوار ترا
خُدا کے سامنے ہے مُلک شرمسار ترا

پلی ہے قوم ترے سایۂ کرم کے تلے
ہمیں نصیب تھی جنت ترے قدم کے تلے

بال گنگا دھر تلک

موت نے رات کے پردے میں کیا کیسا وار
روشنی صبح وطن کی ہے کہ ماتم کا غبار
معرکہ سرد ہے سویا ہے وطن کا سردار
طنطنہ شیر کا باقی نہیں سونی ہے کچھار

بیکسی چھائی ہے تقدیر پھری جاتی ہے
قوم کے ہاتھ سے تلوار گری جاتی ہے

اُٹھ گیا دولتِ ناموس وطن کا وارث
قوم مرحوم کے اعزاز کُہن کا وارث
جاں نثارِ ازلی شیر دکن کا وارث
پیشواؤں کے گرجتے ہوئے رن کا وارث

تھی سمائی ہوئی پونا کی بہار آنکھوں میں
آخری دور کا باقی تھا خمار آنکھوں میں

موت مہاراشٹ کی تھی یا تری مرنے کی خبر
مُردنی چھا گئی انسان تو کیا پتھر پر
پتیاں جھک گئیں مُرجھا گئے صحرا کے شجر
رہ گئے جوش میں بہتے ہوئے دریا تھم کر

سرد و شاداب ہوا رک گئی کہساروں کی
روشنی گھٹ گئی دو چار گھڑی تاروں کی

تھا نگہبان وطن دبدبۂ عام ترا　　نہ ڈگیں پاؤں یہ تھا قوم کو پیغام ترا
دل رقیبوں کے لرزتے تھے یہ تھا کام ترا　　نیند سے چونک پڑے سُن جو لیا نام ترا

یاد کر کے تجھے مظلوم وطن روئیں گے
بندۂ رسم جفا چین سے اب سوئیں گے

زندگی تیری بہارِ چمنستانِ وفا　　آبرو تیرے لئے قوم سے پیمانِ وفا
عاشقِ نام وطن کشتۂ ارمانِ وفا　　مرد میدانِ وفا جسمِ وفا جانِ وفا

ہو گئی نذرِ وطن ہستیِ فانی تیری
نہ تو پیری رہی تیری نہ جوانی تیری

اوجِ ہمت پہ رہا تیری وفا کا خورشید　　موت کے خوف پہ غالب رہی خدمت کی اُمید
بن گیا قید کا فرمان بھی راحت کی نوید　　ہوئے تاریکیِ زنداں میں ترے بال سپید

پھر رہا ہے مری نظروں میں سراپا تیرا
آہ وہ قید ستم اور بڑھاپا تیرا

معجزہ اشک محبت کا دکھایا تو نے　　ایک قطرہ سے یہ طوفان اُٹھایا تو نے
مُلک کو ہستیِ بیدار بنایا تو نے　　جذبۂ قوم کے جادو کو جگایا تو نے

اک تڑپ آ گئی سوتے ہوئے ارمانوں میں

بجلیاں کوند گئیں قوم کے ویرانوں میں

لاش کو تیری سنواریں نہ رقیبانِ کہن ہو جبیں کے لئے صندل کی جگہ خاک وطن

تر ہوا ہے جو شہیدوں کے لہو سے دامن دیں اُسی کا تجھے پنجاب کے مظلوم کفن

شور ماتم نہ ہو جھنکار ہو زنجیروں کی

چاہیئے قوم کے بھیشم کو چتا تیروں کی
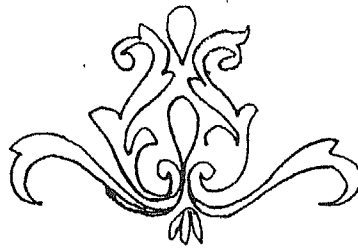
گنگا پرشاد ورما

۱۹۱۲ء

کِس کے ماتم میں یہ سامان سیہ پوشی ہے کچھ عجب طرح کی احباب میں سرگوشی ہے
کہیں سکتا ہے کہیں عالمِ بیہوشی ہے یہ تو مجمع ہے اور اس طرح کی خاموشی ہے
کون دل سرد ہوا غم ہوا تازہ کِس کا
قوم کے سامنے ہے آج جنازہ کِس کا

رنگ چہرہ کا یہ کہتا ہے کہ دل ہیں ناشاد لب تک آتے ہوئے رُکتی ہے گلوں میں فریاد
کیا قیامت ہے کہ اس طرح ہو محفل آباد شام ہو جائے اور آئیں نہیں گنگا پرشاد
کِس نے اس بزم نحوست کی بنا ڈالی ہے
جس کو سب ڈھونڈھتے ہیں اُس کی جگہ خالی ہے

پیڑ سرسبز ہیں تھالوں میں رواں آب بھی ہے ڈوبتی کرنوں سے فوّارے میں اِک تاب بھی ہے
گُلِ نوخیز بھی ہیں سبزۂ شاداب بھی ہے شام کا وقت بھی ہے مجمع احباب بھی ہے
تو کہاں ہے کہ جو اس باغ کا شیدائی ہے
تجھ سے مِلنے کے لئے فصلِ بہار آئی ہے

ہم کو آسان نہیں دل سے مِٹانا تیرا ایک دُنیا کا بُھلانا ہے بُھلانا تیرا
سامنے آنکھوں کے گذرا ہے زمانا تیرا در و دیوار پہ لکھا ہے فسانا تیرا

اس چمن سے جو سرِ شام ہوا آتی ہے
ہم کو اب تک تری باتوں کی صدا آتی ہے

لکھنؤ کا تجھے دم بھر نہ گوارا تھا فراق — مرکے اس خاک کا دامن نہ ملا رنج ہے شاق
لے گیا تجھ کو پہاڑوں میں اجل کا قزاق — رہ گئیں جلوۂ آخر کی نگاہیں مشتاق

دو قدم لاش تری دوش پہ ہم دھر نہ سکے
آخری فرض محبت کا ادا کر نہ سکے

کچھ تجھے مادرِ ناشاد کا آیا نہ خیال — جوشِ طوفاں میں ہے کشتی شکستہ پامال
تیرے ماتم میں پریشاں ہیں وہ برف سے بال — دیکھ ہلتی ہے زمیں سن کے یہ دکھیا کا سوال

مدتوں یاد میں اپنی نہ رلانا ہرگز
میں بھی آتی ہوں مجھے بھول نہ جانا ہرگز

یاد ہے محفلِ عالم میں ابھرنا تیرا — قوم و سرکار کی آنکھوں میں سنورنا تیرا
اور اس طرح سے دنیا سے گذرنا تیرا — زندگی جس پہ ہے صدقے وہ ہے مرنا تیرا

مرنے والے کو یہاں بھائی بہن روتے ہیں
موت تیری ہے کہ سب اہلِ وطن روتے ہیں

بڑھ گئی شومیٔ قسمت کی سیاہی افسوس — آ گئی شہر کے بیڑے پہ تباہی افسوس
مٹ گئی عالمِ اخبار کی شاہی افسوس — اٹھ گیا قوم کے لشکر کا سپاہی افسوس

بابو گنگا پرشاد ورما نے نینی تال میں انتقال کیا تھا

کون میدانِ سیاست میں کمر باندھے گا
قوم کے واسطے سینہ پہ سپر باندھے گا

دردمندی ہوئی پیدا تری راحت کے لئے — دل محبت کے لئے آنکھ مروّت کے لئے
خلق خالق نے کیا تھا تجھے خدمت کے لئے — لی تھی برسوں سے فقیری اسی دولت کے لئے

دل ترا ثروتِ دُنیا سے نہ دمساز رہا
قوم کے در کی گدائی پہ تجھے ناز رہا

ہائے وہ دن کہ ترے گھر کا اُجالا نہ رہا — ماں کا دُنیا میں نشاں گود کا پالا نہ رہا
درد میں دُکھ میں کوئی پوچھنے والا نہ رہا — زہر جینا ہوا امرت کا پیالا نہ رہا

بے خبر تب بھی وطن سے دلِ ناشاد نہ تھا
قوم کے غم سے زیادہ غمِ اولاد نہ تھا

قوم کرتی تھی فقط تیری زباں سے فریاد — بحث و تحریک کے میدان میں قلم تھا آزاد
تیرے اخبار رولائیں گے ترے جوش کی یاد — دل کے ٹکڑے ہیں یہی اور یہی تیری اولاد

ہوں خبردار ترا عشق جتانے والے
ان یتیموں سے ترا نام چلانے والے

جب زمانہ میں ترے اوج کی نوبت آئی — زندگی ختم ہوئی موت کی ساعت آئی
کام کچھ بھی نہ جوانی کی ریاضت آئی — صبح پیری نہیں آئی کہ قیامت آئی

روشنی جس کی تھی ہر سو وہ ستارا ڈوبا
لُٹ گئی شامِ اودھ قوم کا تارا ڈوبا

نہ ستائش کی تمنّا نہ شکایت کا ہراس
رہنما منزلِ ہستی میں فقط قوم کا پاس
مُلک کے عیش سے خوش مُلک کے صدمے سے اُداس
زندگی تیری تھی مردانِ خُدا کا سنیاس

یوگ کہتے ہیں کسے شانِ عبادت کیا ہے
خدمتِ قوم نہیں ہے تو ریاضت کیا ہے

اپنی آنکھوں میں سمائی ہے تری موت کی رات
سُرگ سے آئے ہیں دیوتا کہ رشی کی ہے وفات
ذاتِ معبود سے ملنے ہی کو ہے تیری ذات
طے ہوا جاتا ہے اِک آن میں دریائے نجات

عرش سے فرش پہ سامانِ سفر آیا ہے
چاند کشتی لئے گردوں سے اُتر آیا ہے

یُوں تو دُنیا میں ہمیشہ سے ہے مرنے کا چلن
اپنے بچّوں کو نگلتی ہے زمیں کی ناگن
داغ دیتا ہے مگر جب کوئی دل سوزِ وطن
اس کے صدمے سے لرزتا ہے یہ ایوانِ کُہن

چاندنی رات میں جس وقت ہوا آتی ہے
قوم کے دل کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے

یُوں ہی دُنیا میں تجھے اہلِ نظر روتے ہیں
آنکھ میں اشک نہ ہو قلب و جگر روتے ہیں
آدمی کیا ہیں شجر اور حجر روتے ہیں
پھول شبنم کی طرح شام و سحر روتے ہیں

جس کو انسان بھلا دے یہ وہ آزار نہیں
یہ ہے وہ زخم جو مرہم کا طلبگار نہیں

اقبال نرائن مسلہ داں

سنہ ۱۹۱۶ء

اجل سے جس کی اس بستی میں ویرانہ کا عالم تھا
ابھی تازہ دلوں میں اس حبیبِ قوم کا غم تھا
خبر کس کو یہ تھی نزدیک تیر اروز ماتم تھا
جگر پر لکھنؤ کے یہ اکیلا داغ کیا کم تھا

محبت جس سے تھی جس کو ہمیشہ پیشوا سمجھا
اجل کے راستہ میں بھی اسی کو رہنما سمجھا

وہ چشمِ با مروّت وہ کشادہ لوحِ پیشانی
نہیں ہٹتی نگاہوں سے تری تصویرِ نورانی
نہ ابرو پر شکن لائی کبھی دل کی پریشانی
ہنسی کا سحر لب پر گفتگو کا طرز لاثانی

ابھی کچھ رات باقی ہے یہ قدرت کا اشارہ تھا
جھلکتا دور ہی سے صبحِ پیری کا ستارہ تھا

لبِ خاموش کو دعویٰ نہ تھا رنگیں نوائی کا
سبق سکھا نہ تھا فطرت نے تیری خود نمائی کا
چمکتا تھا مگر جوہر طبیعت کی صفائی کا
نہ عادت خود پرستی کی نہ سودا پیشوائی کا

ع۔ گنگا پرشاد ورما۔

حلاوت تھی وطن اور قوم کی خدمت سے جینے میں
امانت تھی خدا کی اک دلِ پُر درد سینے میں

ترے خُلق و مروّت کی بُھلائیں یاد کیونکر ہم — خلش رکھنے کو سینے میں چھپا ہیں یہ نشتر ہم
جو قائم تھا ترے دم سے وہ شیرازہ ہوا برہم — ترا لُطفِ سخن تھا دل کے زخموں کے لئے مرہم

پیامِ صُلح دینا شکوۂ احباب سُن لینا
ترا شیوہ رہا کانٹوں سے بچ کر پھول چُن لینا

بہت دیکھا ہوا ہے رنگ دُنیا کی رفاقت کا — کہیں عشقِ مراتب ہے کہیں ہے رُعب دولت کا
وفا بدنام ہے بازار کھوٹا ہے محبّت کا — مگر اس داغ سے خالی تھا سکّہ تیری اُلفت کا

یہ رُتبہ آدمی کے واسطے دُنیا میں کیا کم ہے
عزیزوں سے زیادہ دوستوں میں تیرا ماتم ہے

جگہ خالی ہے تیری دل پہ سنّاٹا سا ہے طاری — رُلاتی ہے لہو احباب کو یادِ وفاداری
مگر سب سے زیادہ زخم اُس بیکس کا ہے کاری — جو اپنی زندگی سمجھا ہوا تھا تیری غمخواری

لبِ مایوس پر اُس کے یہ حسرت کا ترانہ ہے
"کوئی آگے روانہ ہے کوئی پیچھے روانہ ہے"

نہ دولت یاد آتی ہے نہ غم ہوتا ہے ثروت کا — جسے روتی ہے دُنیا ہے وہ جوہر آدمیت کا
مآلِ زندگی ہے لاش پر آنسو محبت کا — دُعائے خیر مرنے پر صلہ ہے حُسنِ خدمت کا

ع بشن نرائن در

سفر اس روح کا بھی طے ہو رحمت کے اُجالے میں
"خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں"

نشترِ یاسؔ

تیج نرائن چکبست کی وفات پر یہ نظم لکھی ہے

سنہ ۱۹۱۵ء

نہ اعتبار سہی اس حیاتِ فانی کا — مگر اُمید سے ہے لُطف زندگانی کا
پیامِ مرگ ہے غمِ یاسِ جاودانی کا — شباب روح کا ہے حوصلہ جوانی کا

بشر کا دل نہ ہو زندہ تو آب و گل کیا ہے
فقط طلسم اُمیدوں کا ہے یہ دل کیا ہے

شہیدِ یاس چلا دل پہ تیرے کون خدنگ — تڑپ کے خاک ہوئی دل میں کیوں دل کی اُمنگ
کہ جس سے رنگِ طبیعت کا ہو گیا بے رنگ — ہوا ترانۂ ہستی کا ساز بے آہنگ

بنا حیات کا ارمان آبلہ دل کا
لُٹا شباب کی منزل میں قافلہ دل کا

ع مصنف کے ایک نوجوان عزیز نے جس کا نام تیج نرائن چکبست تھا عالمِ جنون میں خودکشی کر لی تھی
اُس کی وفات پر یہ نظم کہی گئی تھی۔

کُھلا نہ راز طبیعت کی بے قراری کا　　زباں کو پاس رہا دل کی پردہ داری کا
جنوں میں ہوش رہا ضبط آہ وزاری کا　　نشاں طبیب نے پایا نہ زخم کاری کا

کسی نے بھی نہ طبیعت کا یہ فسوں سمجھا
کوئی رُتک کوئی سودا کوئی جنوں سمجھا

زباں کی طرح ہے رگ رگ سے یہ صدا جاری　　طبیب کھو نہ سکا زندگی کی بیماری
ہے تیری نعش پہ بھی عالمِ جنوں طاری　　کفن پہ چار طرف ہے لہو سے گُل کاری

ستم کشوں کے لئے طرفہ یادگار ہے یہ
ترے شباب کی بس آخری بہار ہے یہ

جب اپنی جا سے اُبلتا ہے چشمۂ کُہسار　　قدم قدم پہ دکھاتا ہے جوش کی رفتار
مگر جو راہ میں حائل ہو پتھروں کا فشار　　تو یوں بکھرتا ہے قطروں میں جیسے اشک کا تار

شباب یوں ہی لٹا بے کسی کے بسمل کا
ستم ہے جوش جوانی میں ٹوٹنا دل کا

دُعائیں دیتے تھے جس گود میں کھلا کے تجھے　　اُسی میں آج سُلایا کفن پہنا کے تجھے
گُناہگار ہوئے لکھنؤ میں لا کے تجھے　　خموش بیٹھے ہیں اب خاک میں ملا کے تجھے

دُعا کا غم نہ دَوا کی ہے جُستجو باقی
جو دل میں ہے تو ہے مَرنے کی آرزو باقی

جو دل کو توڑ دے وہ ماتمِ شباب ہے یہ　　جو اپنی جان پہ رہتا ہے وہ عتاب ہے یہ
جو عمر بھر رہے وہ بے کسی کا خواب ہے یہ　　کسی غریب کی ہستی کا انقلاب ہے یہ

جو دل میں دردِ محبت تھا آج داغ ہوا
چتا کی آگ سے روشن یہی چراغ ہوا۔

جہاں میں دیکھے ہیں ایسے بھی خوش نصیب شجر　　سدھارتے ہیں جو گلشن سے پھول کر پھل کر
نظر سے گذرے ہیں ایسے بھی نخل بار آور　　جو سوکھ جاتے ہیں فصلِ بہار میں آکر

مگر بہار و خزاں تھی نہ اس شجر کے لئے
زمیں سے اس نے اُٹھایا تھا سر تبر کے لئے
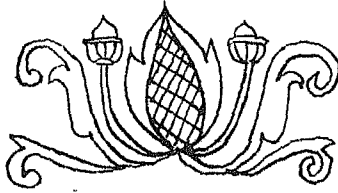
ماتمِ یاسؔ

سنہ ۱۹۱۱ء

اے جوانی کے مسافر اے اجل کے میہماں — سو گیا تو سنتے سنتے زندگی کی داستاں
تھک کے نیند آئی ہے ہوتا ہے یہ چتوں سے عیاں — نیم باز آنکھوں میں ہے کیفیتِ خوابِ گراں

کارِ دنیا سے کوئی یوں بے خبر ہوتا نہیں
رات بھر جاگا ہوا دولھا بھی یوں سوتا نہیں

صبح کا تارا بھی چمکا، ہو گیا دن آشکار — تیرے چہرے سے مگر سرکی نہ چادر زرنگار
دیکھ لے اٹھ کر ذرا اپنی جوانی کی بہار — سن تو کیا کہتی ہے ماں شانہ ہلا کر بار بار

یہ کفن ہرگز نہیں تیرے پنھانے کے لئے
لائی ہوں خلعت تجھے دولھا بنانے کے لئے

محفلِ احباب میں ماتم ہے تو ہے مستِ خواب — کچھ خبر ہے آج کس کس کی ہوئی مٹی خراب
آخری تسلیم کے مشتاق ہیں کچھ دے جواب — پھر نظر آئے گی کا ہے کو یہ تصویرِ شباب

ہنس کے ہر اک بات پر وہ جنبشِ ابرو کہاں
اک نظر پھر دیکھ لے اب ہم کہاں اور تو کہاں

ؔ مصنف کے ایک ہونہار اور جوان مرگ عزیز پنڈت اجودھیا ناتھ آغا کی وفات پر یہ نوحہ تصنیف ہوا تھا۔

اے محبت کے فرشتے اے وفا کے آفتاب　　　تیرے سینے میں صفا تھی جیسے آئینہ میں آب
واسطے دشمن کے بھی لایا نہ تو دل میں عتاب　　　آج کیوں آتا ہے تجھ کو بھائی بہنوں سے حجاب

آج تو سنتا کسی کی گریہ وزاری نہیں
او عدم کے جانے والے یہ وفاداری نہیں

ماں کو رونا ہے کہ جاتا ہے تو جا بل کر گلے　　　بھائی کہتا ہے رہوں گا کس کی چھاتی کے تلے
کہتی ہیں بہنیں کہاں منہ موڑ کر بھائی چلے　　　دھیان کچھ اس کا بھی ہے جس گود میں تم تھے پلے

کچھ سہارا چاہیئے اہلِ محن کے واسطے
بھائی کی ڈھارس بڑی شئے ہے بہن کے واسطے

تیری بالیں پر کھڑا ہے اور بھی اک سوگوار　　　وہ عزیزوں سے سوا تیرا انیس و غمگسار
چھوڑ کر گھر بار تجھ پر جان کی اپنی نثار　　　یہ محبت کا فسانہ بھی رہے گا یادگار

گو کہ باقی اب دلوں میں جذبۂ عالی نہیں
پاک روحوں سے مگر دنیا ابھی خالی نہیں

اس شہیدِ یاس کا صدمہ عیاں ہوتا نہیں　　　آہ وہ کرتا نہیں اشکوں سے منہ دھوتا نہیں
جانِ غمگیں نالہ و فریاد سے کھوتا نہیں　　　کیا قیامت ہے کہ سب روتے ہیں وہ روتا نہیں

نالہ و فریاد اس کے زخم کا مرہم نہیں
چار آنسو کا جو ہو محتاج یہ وہ غم نہیں

یہ وہ رونا ہے جو روتے ہیں ترے پس ماندگاں ہے دلِ ناشاد کو کچھ اور ہی رونا یہاں
یاد کر کے ان کو روتی ہے یہ چشمِ خوں فشاں تیری پیشانی پہ دیکھے تھے جو عظمت کے نشاں

تُو مرا کیا قوم کا تیری مقدّر پھر گیا
ایک موتی اور دامن سے ہمارے گر گیا

وہ ادب وہ علم وہ تہذیب اور وہ انکسار زندگی تیری تھی ہمچشموں میں اپنے یادگار
زیورِ اخلاق تھا تیری جوانی کا سنگار جب تلک زندہ رہا یکساں رہا تیرا شعار

خدمتِ انسان و یادِ کبریا ہوتی رہی
دل کے آئینہ پہ مذہب کی جلا ہوتی رہی

تو نے جس دنیا میں کھولی آنکھ اے نقشِ فنا کچھ موافق تھی نہ تیرے واسطے اس کی ہوا
فیضِ قدرت نے مگر جوہر کئے ایسے عطا باعثِ حیرت ہوئی دل کو تری نشو و نما

میں یہ کہتا تھا کہ خاکستر سے آئینہ ملا
نور تاریکی میں ویرانے میں گنجینہ ملا

یہ تمنا تھی یہ آئینہ جلا پائے گا اب پھیل کر یہ نورِ بزمِ قوم تک آئے گا اب
علم کا افلاس اس دولت سے مٹ جائیگا اب جانتا تھا کون گردوں یہ ستم ڈھائے گا اب

آئینہ ٹوٹا نظر سے نورِ ہستی کھو گیا
یہ خزانہ قوم کی قسمت سے مٹی ہو گیا

اس دلِ ناشاد میں کچھ حسرتوں کے ہیں مزار اور اک چھوٹی سی تربت ہوگی تیری یادگار

پھول جب گلزار میں لائیں گے پیغامِ بہار یاد کرکے تجھ کو یوں روئے گا تیرا سوگوار

"کھل کے گُل کچھ تو بہارِ جانفزا دکھلا گئے"

"حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بِن کھلے مرجھا گئے"

تیری ہستی تھی اگر دیباچۂ اندوہ غم عالمِ فانی میں رکھا کس لئے تو نے قدم

اُن پہ حسرت ہے جو یوں دیتے ہیں غمگینوں کو دم خواب یہ دُنیا ہے یاں کیسی خوشی کیسا الم

انتظامِ دہر میں آخر ہے یہ تدبیر کیا

خوابِ دُنیا ہے تو ہے اس خواب کی تعبیر کیا
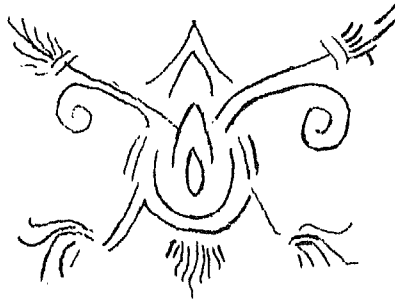
یادگار بابو گنگا پرشاد ورما

مرحبا قوم کی جانب سے عزیزانِ وطن   یادرہ جائے گا یہ مجمعِ یارانِ وطن

آج وہ دن ہے کہ پورا ہوا پیمانِ وطن   اس عمارت سے ہوئی زینت ایوانِ وطن

قوم کے جذبۂ اخلاص کی تصویر ہے یہ

جس کی بُنیاد دلوں میں ہے وہ تعمیر ہے یہ

قوم کے سر پہ سلامت نہیں گنگا پرشاد   ایسے مُحسن کی مگر دل سے نکلتی نہیں یاد

دردمندوں کی کمائی نہیں جاتی برباد   جلوۂ فیض سے اس کے ہے یہ خطہ آباد

چھپ گیا چاند مگر ہے ابھی ہالا باقی

شمع باقی نہیں لیکن ہے اُجالا باقی

دولتِ علم لُٹے گی اسی در سے دن رات   ہم نے سوچی ہے یہی نام پہ اس کے خیرات

دَیر سے آئیں برہمن کہ حرم سے سادات   سب یہاں پائیں گے سرمایۂ تسکینِ حیات

لُطف قائم سحر و شام رہے گا اس کا

فیض دریا کی طرح عام رہے گا اس کا

عہ لکھنؤ میں بابو گنگا پرشاد ورما کی یادگار میں ایک کُتب خانہ قائم کیا گیا ہے۔ اس کتب خانہ کی نو تعمیر عمارت کا افتتاحی جلسہ زیرِ صدارت ہز اکسلنسی سر ولیم میرس بہادر قرار پایا تھا۔ یہ نظم اسی موقع پر پڑھی گئی تھی۔

جو گدا قوم[1] کے پھیری پہ نکل آئیں گے
اس کی دیوار کے سایہ میں جگہ پائیں گے
نغمۂ حُبِّ وطن شام و سحر گائیں گے
چمنِ علم کی دن رات ہوا کھائیں گے

نیند میں ہو گا سماں عالمِ ہشیاری کا
خواب دیکھیں گے یہاں قوم کی بیداری کا

آج کرسیِ صدارت پہ جو ہے جلوہ فگن
باغباں ہو کے سنوارے گا وہ یہ پاک چمن
قدرداں علم کا اور جوہریِ جوہرِ فن
شمع پہلی وہی اس در پہ کرے گا روشن

کہیں کرتی ہے کرم رحمتِ باری ایسا
ایسا مندر ہو تو موزوں ہے پُجاری ایسا
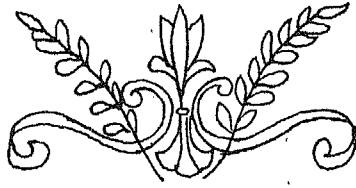
[1] اس عمارت کے بالائی حصّہ میں اُن محبانِ وطن کے ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا جو کسی قوم یا مُلکی خدمت کی غرض سے لکھنؤ میں تشریف لائیں گے۔

حصّہ چہارم

مذہبِ شاعرانہ

سنہ ۱۹۰۵ء

کہتے ہیں جسے ابر وہ میخانہ ہے میرا
جو پھول کھلا باغ میں پیمانہ ہے میرا

کیفیتِ گلشن ہے مرے نشہ کا عالم
کوئل کی صدا نعرۂ مستانہ ہے میرا

پیتا ہوں وہ مے نشہ اُترتا نہیں جس کا
خالی نہیں ہوتا ہے وہ پیمانہ ہے میرا

دریا مِرا آئینہ ہے لہریں مرے گیسو
اور موجِ نسیمِ سحری شانہ ہے میرا

ہر ذرّۂ خاکی ہے مرا مونس و ہمدم
دُنیا جسے کہتے ہیں وہ کاشانہ ہے میرا

جس جا ہو خوشی ہے وہ مجھے منزلِ راحت
جس گھر میں ہو ماتم وہ عزاخانہ ہے میرا

جس گوشۂ دُنیا میں پرستش ہو وفا کی
کعبہ ہے وہی اور وہی بُتخانہ ہے میرا

مَیں دوست بھی اپنا ہوں عدو بھی ہوں مَیں اپنا
اپنا ہے کوئی اور نہ بیگانہ ہے میرا

عاشق بھی ہوں معشوق بھی یہ طرفہ مزا ہے
دیوانہ ہوں مَیں جس کا وہ دیوانہ ہے میرا

خاموشی میں یاں رہتا ہے تقریر کا عالم
میرے لبِ خاموش پہ افسانہ ہے میرا

کہتے ہیں خودی کس کو خُدا نام ہے کس کا
دُنیا میں فقط جلوۂ جانانہ ہے میرا

ملتا نہیں ہر ایک کو وہ نور ہے مجھ میں　　جو صاحب بینش ہے وہ پروانہ ہے میرا

شاعر کا سخن کم نہیں مجذوب کی بڑ سے

ہر ایک نہ سمجھے گا وہ افسانہ ہے میرا

سنہ ۱۹۱۷ء

فنا نہیں ہے محبت کے رنگ و بو کے لئے　　بہار عالم فانی رہے رہے نہ رہے

جنون حب وطن کا مزا شباب میں ہے　　لہو میں پھر یہ روانی رہے رہے نہ رہے

رہے گی آب و ہوا میں خیال کی بجلی　　یہ مشت خاک ہے فانی رہے رہے نہ رہے

جو دل میں زخم لگے ہیں وہ خود پکاریں گے　　زباں کی سیف بیانی رہے رہے نہ رہے

مٹا رہا ہے زمانہ وطن کے مندر کو　　یہ مرمٹوں کی نشانی رہے رہے نہ رہے

دلوں میں آگ لگے یہ وفا کا جوہر ہے　　یہ جمع خرچ زبانی رہے رہے نہ رہے

جو مانگنا ہے ابھی مانگ لو وطن کے لئے

یہ آرزو کی جوانی رہے رہے نہ رہے

١٩١٧ء

مٹنے والوں کی وفا کا یہ سبق یاد رہے ‏ ‏ بیڑیاں پاؤں میں ہوں اور دل آزاد رہے

ایک ساغر بھی عنایت نہ ہوا یاد رہے ‏ ‏ ساقیا جاتے ہیں محفل تری آباد رہے

دل وہ دل ہے جو سدا ضبط سے ناشاد رہے ‏ ‏ لب وہ لب ہے جو نہ شرمندۂ فریاد رہے

خوشنوائی کا سبق میں نے قفس میں سیکھا ‏ ‏ کیا کہوں اور سلامت مرا صیاد رہے

تار بگڑا ہوا ہے دل کو سنبھالوں کب تک ‏ ‏ لے کی پابند کہاں تک مری فریاد رہے

آپ سے ہم سے ہوا تھا کبھی پیمانِ وفا ‏ ‏ کیجئے ظلم مگر وہ بھی گھڑی یاد رہے

باغباں دل سے وطن کو یہ دعا دیتا ہے ‏ ‏ میں رہوں یا نہ رہوں یہ چمن آباد رہے

مجھ کو مل جائے چہکنے کے لئے شاخ مری ‏ ‏ کون کہتا ہے کہ گلشن میں نہ صیاد رہے

جذبۂ قوم سے خالی نہ ہو سودائے شباب ‏ ‏ وہ جوانی ہے جو اس شوق میں برباد رہے

حکم مالی کا یہ ہے پھول نہ ہنسنے پائیں ‏ ‏ چپ رہے باغ میں کوئل اگر آزاد رہے

باغ میں لے کے جنم ہم نے اسیری جھیلی ‏ ‏ ہم سے اچھے رہے جنگل میں جو آزاد رہے

دم سے گاندھی کے رہے شور وفا بستی میں
قیس جنگل میں رہے کوہ پہ فرہاد رہے

سنہ ۱۹۱۷ء

زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں — مرے خیال کو بیڑی پنہا نہیں سکتے

یہ کیسی بزم ہے اور کیسے اِس کے ساقی ہیں — شراب ہاتھ میں ہے اور پِلا نہیں سکتے

یہ بیکسی بھی عجب بیکسی ہے دُنیا میں — کوئی ستائے ہمیں ہم ستا نہیں سکتے

کشش وفا کی اُنھیں[ع] کھینچ لائی آخرِ کار — یہ تھا رقیب کو دعویٰ وہ آ نہیں سکتے

جو تو کہے تو شکایت کا ذکر کم کر دیں — مگر یقیں ترے وعدوں پہ لا نہیں سکتے

چراغ قوم کا روشن ہے عرش پر دل کے
اِسے ہَوا کے فرشتے بجھا نہیں سکتے

کبھی تھا ناز زمانہ کو اپنے ہند پہ بھی — پر اب عروج وہ علم و کمال فن میں نہیں

رگوں میں خوں ہے وہی دل وہی جگر ہے وہی — وہی زباں ہے مگر وہ اثر سخن میں نہیں

وہی ہے بزم وہی شمع ہے وہی فانوس — فدائے بزم وہ پروانے انجمن میں نہیں

وہی ہَوا وہی کوئل وہی پپیہا ہے — وہی چمن ہے پہ وہ باغباں چمن میں نہیں

غرور و جہل نے ہندوستاں کو لوٹ لیا
بجز نفاق کے اب خاک بھی وطن میں نہیں

ع مسٹر مانٹیگو وزیر ہند۔

کسے معلوم ہے کیا رنگ بدلے اب فغاں اپنی
خدا حافظ ہے دل کا بند ہوتی ہے زباں اپنی

اسیرِ ضبط ہو کر تنگ ہے منہ میں زباں اپنی
رگِ گردن سے نکلی ہے لہو بن کر فغاں اپنی

پڑی ہیں تیر بن بن کر نگاہیں پارساؤں کی
غزالانِ حرم بھولے ہوئے ہیں شوخیاں اپنی

شفق ہے آسماں پر لالہ و گل باغ و صحرا میں
دکھاتا ہے شہیدوں کا لہو رنگینیاں اپنی

گلوں نے باغ چھوڑا تنگ آکر جورِ گلچیں سے
چمن ویران ہوتا ہے خبر لے باغباں اپنی

فغانِ دردِ دل پر بھی گماں ہے بدزبانی کا
ستمگر سن نہیں سکتا ہے شاید داستاں اپنی

کہیں تو کیا کہیں یا چپ رہیں مظلوم حیراں ہیں
بیاں کرتے ہیں وہ اپنی زباں سے خوبیاں اپنی

فریبِ زندگی جس نے نہ دیکھا ہو مجھے دیکھے
نہ سینے میں ہے دل اپنا نہ منہ میں ہے زباں اپنی

صدا دیتا ہے یہ میرا گریباں چاک ہونے پر
ہزاروں پیرہن پیدا کریں گی دھجیاں اپنی

ہزاروں آرزوئیں داغ بن کر دل میں پنہاں ہیں
کہ جن کا نام لینے سے لرزتی ہے زباں اپنی

نہ بدلی ہے نہ بدلے گی ترنگ اپنی طبیعت کی
دکھائے گا کہاں تک آسماں نیرنگیاں اپنی

۱۹۱۹ء

اُنھیں یہ فکر ہے ہر دم نئی طرزِ جفا کیا ہے
ہمیں یہ شوق ہے دیکھیں ستم کی انتہا کیا ہے

گنہگاروں میں شامل ہیں گناہوں سے نہیں واقف
سزا کو جانتے ہیں ہم خُدا جانے خطا کیا ہے

یہ رنگِ بیکسی رنگِ جنوں بن جائے گا غافل
سمجھ لے یاس و حرماں کے مرض کی انتہا کیا ہے

نیا بسمل ہوں میں واقف نہیں رسمِ شہادت سے
بتا دے تو ہی اے ظالم تڑپنے کی ادا کیا ہے

چمکتا ہے شہیدوں کا لہو پردہ میں قدرت کے
شفق کا حُسن کیا ہے شوخیِ رنگِ حنا کیا ہے

اُمیدیں مل گئیں مٹّی میں دورِ ضبط آخر ہے
صدائے غیب بتلا دے ہمیں حکمِ خُدا کیا ہے

عہ یہ نظم پنجاب کے مارشل لا کے وقت کہی گئی تھی۔

سنہ ۱۹۱۷ء

گردنیں خم ہیں ندامت سے دل آزاروں کی | رہ گئی بات زمانہ میں وفاداروں کی
قاضیٔ وقت نے برسات میں توبہ توڑی | رند آزاد ہوئے عید ہے میخواروں کی
قید سے چھوٹ کے آئے ہیں وفا کے یوسف | سرِ بازار ہے کیا بھیڑ خریداروں کی
بے گناہوں کا تو انصاف ہوا دنیا میں | اب ہمیں دیکھنی ہے شرم گنہگاروں کی
بیڑیاں کٹ کے گریں خاک کے پتلے کی بھی آج | روح آزاد تھی پہلے ہی گرفتاروں کی
دل میں اس طرح سے ارمان ہیں آزادی کے | جیسے گنگا میں جھلکتی ہے چمک تاروں کی

سنہ ۱۹۱۶ء

اذاں سے نعرۂ ناقوس پیدا ہو نہیں سکتا
ابھی کچھ روز تک کعبہ کلیسا ہو نہیں سکتا
زباں سے جوش قومی دل میں پیدا ہو نہیں سکتا
ابلنے سے کنواں وسعت میں دریا ہو نہیں سکتا
بہت پنہاں رہی دل میں خلش خارِ تعصب کی
مگر اب امتحاں کے وقت پردا ہو نہیں سکتا

ع یہ نظم مسز بیسنٹ کی نظر بندی کا حکم منسوخ ہونے کے زمانہ میں تصنیف کی گئی تھی۔

جُدا سینے سے دل ہو دست و بازو قوم کے شل ہوں
مگر دل سے جُدا دم بھر یہ کانٹا ہو نہیں سکتا

گراں ہے جنس اور نیت خریداروں کی ابتر ہے
اَب اِس بازار میں اُلفت کا سودا ہو نہیں سکتا

جِسے ہے فکر مرہم کی اُسے قاتل سمجھتے ہیں
الٰہی خیر ہو یہ زخم اچھّا ہو نہیں سکتا

کمالِ بُزدلی ہے پست ہونا اپنی آنکھوں میں
اگر تھوڑی سی ہمت ہو تو پھر کیا ہو نہیں سکتا

اُبھرنے ہی نہیں دیتی یہاں بے مائیگی دل کی
نہیں تو کون قطرہ ہے جو دریا ہو نہیں سکتا

محبت ہے مجھے کوئل کے درد انگیز نالوں سے
چمن میں جا کے مَیں پھولوں کا شیدا ہو نہیں سکتا

دل پہ احباب کے ہے داغِ محبّت باقی　　رہ گئی اک یہی دُنیا میں نشانی میری

[۱۹۱۵ء

فسانہ ہو گئے آزار دشمن کی بُرائی کے
لگے وہ زخم دل پر دوستوں کی بیوفائی کے

بروں سے بھی یہاں برتاؤ رکھتے ہیں بھلائی کے
بنایا باوفا اس دل کو صدقے بے وفائی کے

زمانہ کی محبت پر نہ ہو اے ہمنشیں نازاں
سُنائیں گے تجھے فرصت میں قصے آشنائی کے

یہ وہ غم ہے کہ جس کی پرورش دل خوب کرتا ہے
زباں تک لا نہیں سکتا ہوں شکوے بیوفائی کے

جلادی دل کو میرے قلب دشمن کی سیاہی نے
کدورت واں بڑھی اور یاں کھلے جوہر صفائی کے

درِ تدبیر پر سر پھوڑنا شیوہ رہا اپنا
وسیلے ہاتھ ہی آئے نہ قسمت آزمائی کے

نئی تہذیب کے صدقے نہ شرمانے دیا دل کو
رہے منطق کے پردے میں کرشمے بیحیائی کے

سال ۱۹۱۵ء

اگر دردِ محبت سے نہ انساں آشنا ہوتا
نہ کچھ مرنے کا غم ہوتا نہ جینے کا مزا ہوتا

بہارِ گُل میں دیوانوں کا صحرا میں پرا ہوتا
جدھر اُٹھتی نظر تو سوں تلک جنگل ہرا ہوتا

مئے گُل رنگ لُٹتی یوں درِ میخانہ وا ہوتا
نہ پینے میں کمی ہوتی نہ ساقی سے گلا ہوتا

ہزاروں جان دیتے ہیں بتوں کی بیوفائی پر
اگر ان میں سے کوئی باوفا ہوتا تو کیا ہوتا

رُلایا اہلِ محفل کو نگاہِ یاس نے میری
قیامت تھی جو اک قطرہ ان آنکھوں سے جدا ہوتا

خدا کو بھول کر انسان کے دل کا یہ عالم ہے
یہ آئینہ اگر صورت نُما ہوتا تو کیا ہوتا

اگر دم بھر بھی مٹ جاتی خلش خارِ تمنا کی
دلِ حسرت طلب کو اپنی ہستی سے گلا ہوتا

ہوس جینے کی ہے یوں عمر کے بیکار کٹنے پر
جو ہم سے زندگی کا حق ادا ہوتا تو کیا ہوتا

یہ مانا بے حجابانہ نگاہیں قہر کرتی ہیں
مگر حُسنِ حیا پرور کا عالم دوسرا ہوتا

زباں کے زور پر ہنگامہ آرائی سے کیا حاصل
وطن میں ایک دل ہوتا مگر درد آشنا ہوتا

تو گرفتارِ بلا ہوں کچھ کہا جاتا نہیں
نالہ کرنا بھی مجھے اے ہمنشیں آتا نہیں

مردِ قانع کو نہیں رہتی گدائی کی ہوس
پاؤں پھیلا کر جو بیٹھا ہاتھ پھیلاتا نہیں

مردِ میدانِ محبت زندۂ جاوید ہیں
موت آ جانے سے تو انسان مر جاتا نہیں

۱۹۱۵ء

خدمتِ انساں سے دل کو آشنا کرتے رہے
دل کے آئینہ پہ اُلفت کی جِلا کرتے رہے

دوستی میں اپنا اپنا حق ادا کرتے رہے
وہ جفا کرتے رہے اور ہم وفا کرتے رہے

کیا کہیں کس سے کہیں دُنیا میں کیا کرتے رہے
بدعتیں ہوتی رہیں شکرِ خُدا کرتے رہے

اہلِ ہمت منزلِ مقصود تک آ بھی گئے
بندۂ تقدیر قسمت سے گِلا کرتے رہے

۱۹۱۵ء

جہاں میں آنکھ جو کھولی فنا کو بھول گئے
کچھ ابتدا ہی میں ہم انتہا کو بھول گئے

نفاق گبر و مُسلماں کا یوں مٹا آخر
یہ بُت کو بھول گئے وہ خُدا کو بھول گئے

ہوا مزاج کا عالم یہ سیرِ یورپ سے
کہ اپنے مُلک کی آب و ہوا کو بھول گئے

زمیں لرزتی ہے بہتے ہیں خون کے دریا
خودی کے جوش میں بندے خُدا کو بھول گئے

یہ انقلاب ہوا عالمِ اسیری میں
قفس میں رہ کے ہم اپنی صدا کو بھول گئے

جذبۂ شوق کی تاثیر دکھا دیتے ہیں
ہم وہ پیاسے ہیں کہ دریا کو بلا لیتے ہیں

۱۹۱۰ء

فنا کا ہوش آنا زندگی کا درد سر جانا — اجل کیا ہے خمارِ بادۂ ہستی اتر جانا

عزیزانِ وطن کو غنچہ و برگ و ثمر جانا — خدا کو باغباں اور قوم کو ہم نے شجر جانا

وہ گلشن کی فضا اور چاندنی کا وہ نکھر جانا — وہ بڑھ کر گیسوئے لیلائے شب کا تا کمر جانا

عروسِ جاں نیا پیراہنِ ہستی بدلتی ہے — فقط تمہید آنے کی ہے دنیا سے گذر جانا

مصیبت میں بشر کے جوہرِ مردانہ کھلتے ہیں — مبارک بزدلوں کو گردشِ قسمت سے ڈر جانا

وہ طبعِ یاس پرور نے مجھے چشمِ عقیدت دی — کہ شامِ غم کی تاریکی کو بھی نورِ سحر جانا

سوادِ خلد سمجھا گنجِ مرقد کی سیاہی کو — سپیدی کو کفن کی، ہم نے جنت کی سحر جانا

گدا نے سلطنت کی شکرِ حق سے اور قناعت سے — زباں کو تیغ اور نانِ شبینہ کو سپر جانا

وہی قطرہ لہو کا اشک بن کر گر گیا رسوا — جسے ہم نے نمک پروردۂ زخمِ جگر جانا

مقام کوچ کیا ہے منزلِ مقصود تک پہونچے — قیامت تھا سرائے دہر میں وہ دن ٹھہر جانا

بہت سودا رہا واعظ تجھے نارِ جہنم کا — مزہ سوزِ محبت کا بھی کچھ لے بے خبر جانا

کرشمہ یہ بھی ہے اے بے خبر افلاسِ قومی کا — تلاشِ رزق میں اہلِ ہنر کا دربدر جانا

اجل کی نیند میں بھی خوابِ ہستی گر نظر آیا — تو پھر بے کار ہے تنگ آ کے اس دنیا سے مر جانا

وہ سودا زندگی کا ہے کہ غم انسان سہتا ہے — نہیں تو ہے بہت آسان اس جینے سے مر جانا

چمن زارِ محبت میں اسی نے باغبانی کی — کہ جس نے اپنی محنت ہی کو محنت کا ثمر جانا

سدھاری منزلِ ہستی سے کس بے اعتنائی سے
تنِ خاکی کو شاید روح نے گردِ سفر جانا

---

۱۴ سنہ ۱۹۱۱ء

کچھ ایسا پاسِ غیرت اُٹھ گیا اِس عہدِ پُرفن میں
کہ زیور ہو گیا طوقِ غلامی اپنی گردن میں

شجر سکتے میں ہیں خاموش ہیں بُلبُل نشیمن میں
سدھارا قافلہ پھولوں کا سنّاٹا ہے گُلشن میں

گراں تھی دھوپ اور شبنم بھی جن پودوں کو گُلشن میں
تری قدرت سے وہ پھولے پھلے صحرا کے دامن میں

ہوائے تازہ دل کو خود بخود بے چین کرتی ہے
قفس میں کہہ گیا کوئی بہار آئی ہے گُلشن میں

مِٹانا تھا اسے بھی جذبۂ شوقِ فنا تجھ کو
نشانِ قبرِ مجنوں داغ ہے صحرا کے دامن میں

زمانہ میں نہیں اہلِ ہُنر کا قدرداں باقی
نہیں تو سیکڑوں موتی ہیں اِس دریا کے دامن میں

یہاں تسبیح کا حلقہ وہاں زُنّار کا پھندا
اسیری لازمی ہے مذہبِ شیخ و برہمن میں

جنھیں سینچا تھا خونِ دل سے اگلے باغبانوں نے
ترستے اب ہیں پانی کو وہ پودے میرے گُلشن میں

دکھایا معجزہ حُسنِ بشر کا دستِ قدرت نے
بھری تاثیر تصویرِ گِلی کے رنگ روغن میں

شہیدِ یاس ہوں رسوا ہوں ناکامی کے ہاتھوں سے
جگر کا چاک بڑھ کر آ گیا ہے میرے دامن میں

جہاں میں رہ کے یوں قائم ہوں اپنی بے ثباتی پر
کہ جیسے عکسِ گُل رہتا ہے آبِ جوئے گُلشن میں

شرابِ حُسن کو کچھ اور ہی تاثیر دیتا ہے
جوانی کے نمو سے بے خبر ہونا لڑکپن میں

شباب آیا ہے پیدا رنگ ہے رخسارِ نازک سے — فروغِ حُسن کہتا ہے سحر ہوتی ہے گلشن میں
نہیں ہوتا ہے محتاجِ نمایش فیضِ شبنم کا — اندھیری رات میں موتی لُٹا جاتی ہے گلشن میں

متاعِ دردِ دل اِک دولتِ بیدار ہے مجھ کو — دُرِ شہوار ہیں اشکِ محبّت میرے دامن میں
نہ بتلائی کسی نے بھی حقیقت رازِ ہستی کی — بُتوں سے جا کے سر پھوڑا بہت دیر برہمن میں
پُرانی کاوشیں دیر و حرم کی مٹتی جاتی ہیں — نئی تہذیب کے جھگڑے ہیں اب شیخ و برہمن میں
اُڑا کر لے گئی بادِ خزاں اس سال اُس کو بھی — رہا تھا ایک برگِ زرد باقی میرے گلشن میں

وطن کی خاک سے مر کر بھی ہم کو اُنس باقی ہے
مزا دامانِ مادر کا ہے اس مٹی کے دامن میں

۱۹۱۲ء

نہ کوئی دوست دشمن ہو شریکِ دردوغم میرا — سلامت میری گردن پر رہے بارِ الم میرا
بہار آئی ترقی پر ہے سودا دم بہ دم میرا — بڑھا جاتا ہے خود زنجیر کی جانب قدم میرا
لکھا یہ داورِ محشر نے میری فردِ عصیاں پر — یہ وہ بندہ ہے جس پر ناز کرتا ہے کرم میرا
کہا غنچے نے ہنس کر واہ کیا نیرنگ عالم ہے — وجودِ گُل جسے سمجھے ہیں سب ہے وہ عدم میرا
کشاکش ہے اُمید و یاس کی یہ زندگی کیا ہے — الٰہی ایسی ہستی سے تو اچھا تھا عدم میرا
اگر کون و مکاں اِک شعبدہ تھا اس کی قدرت کا — تو اس دُنیا میں آخر کس لیے آیا قدم میرا

دلِ احباب میں گھر ہے شگفتہ رہتی ہے خاطر
یہی جنّت ہے میری اور یہی باغِ ارم میرا

مجھے احباب کی پُرسش کی غیرت مار ڈالے گی
قیامت ہے اگر افشا ہوا رازِ الم میرا

کھڑی تھیں راستہ روکے ہوئے لاکھوں تمنّائیں
شہیدِ یاس ہوں نکلا ہے کس مشکل سے دم میرا

رہی ہے ایک ترکِ آرزو کی آرزو باقی
اسی پر ختم ہے افسانۂ دردو الم میرا

خدا نے علم بخشا ہے ادب احباب کرتے ہیں
یہی دولت ہے میری اور یہی جاہ و حشم میرا

صدا آتی ہے میرے دل کے ویرانے سے راتوں کو
وہ بیہڑ ہوں کہ ایک گوشہ ہے صحرائے عدم میرا

زبانِ حال سے یہ لکھنؤ کی خاک کہتی ہے
مٹایا گردشِ افلاک نے جاہ و حشم میرا

کیا ہے فاش پردہ کفر و دیں کا اس قدر میں نے
کہ دشمن ہے برہمن اور عدو شیخِ حرم میرا

باغباں نے یہ انوکھا ستم ایجاد کیا
آشیاں پھونک کے پانی کو بہت یاد کیا

درِ زنداں پہ لکھا ہے کسی دیوانے نے
وہی آزاد ہے جس نے اِسے آباد کیا

یاد رہ جائے گا ارمان اسیری میرا
جس نے اس باغ میں صیاد کو صیاد کیا

نیند کیا آئے شہادت کے طلبگاروں کو
فکر رہتی ہے ستمگر نے کِسے یاد کیا

ڈر گیا نالۂ شبگیر سے میرے صیاد
شام کو قید کیا صبح کو آزاد کیا

لذّتِ درد کی معراج دکھانے کے لئے
مجھ کو بسمل تجھے اللہ نے جلّاد کیا

جس پہ احباب بہت روئے فقط اتنا تھا — گھر کو ویران کیا قبر کو آباد کیا

عقل کیا چیز ہے اک وضع کی پابندی ہے — دل کو مدّت ہوئی اس قید سے آزاد کیا

جس کفِ پاک کو آنکھوں پہ فرشتوں نے لیا — کیوں خرابات جہاں میں اسے برباد کیا

دم نہیں ہے رگ سودا میں بہار آخر ہے — کیا کروں گا جو مجھے قید سے آزاد کیا

اس کو ناقدری عالم کا صلہ کہتے ہیں
مر چکے ہم تو زمانہ نے بہت یاد کیا

ہم پوجتے ہیں باغِ وطن کی بہار کو — آنکھوں میں اپنی پھول سمجھتے ہیں خار کو

آئے تھے جس چمن سے وہ برباد ہو گیا — اب ہم قفس میں یاد کریں کیا بہار کو

منظور ہے کہ آمدِ گل کا پیام دیں — کلیاں بلا رہی ہیں نسیم بہار کو

اترے ہیں صحن باغ میں پھولوں کے قافلے — نذریں دکھا رہے ہیں عروسِ بہار کو

راحت سے بھی عزیز ہے راحت کی آرزو — دل ڈھونڈھتا ہے سلسلۂ انتظار کو

حسرت جو بچ رہی مرے دل سے ازل کے دن — وہ مل گئی بجھی ہوئی شمعِ مزار کو

یہ کہہ کے اُن کی بزم میں ہم بھی پہونچ گئے — کیا تھا جو آج یاد کیا خاکسار کو

دامانِ کوہ اس کے لئے ماں کی گود ہے — لیکن ذرا بھی چین نہیں آبشار کو

لایا ہے کیا پیامِ وطن پوچھتا ہوں میں — غربت میں دیکھتا ہوں جو ابرِ بہار کو

خود ہی مٹا کے جوہرِ ایمان و آبرو　　ہم کوستے ہیں گردشِ لیل و نہار کو

ہیں باغباں کے بھیس میں گلچیں فرنگ کے
نکلے ہیں لُوٹنے چمنِ روزگار کو

ارمان یہی ہے یہی عالم ہے نظر میں　　جو بجھ نہ سکے آگ وہ پیدا ہو جگر میں

ہے شوق کی منزل یہی دُنیا کے سفر میں　　کیا خاک جوانی ہے جو سودا نہیں سر میں

دُنیا مرے نالوں سے کھنچ آتی ہے قفس تک　　میلا سا لگا رہتا ہے صیاد کے گھر میں

پابند قفس کی نہیں یہ آہِ شرربار　　لگ جائے کہیں آگ نہ صیاد کے گھر میں

کہتی ہے قضا مُفت کے پیدا ہوں گُنہگار　　تلوار سجی ہے مرے قاتل کی کمر میں

رہتی ہیں اُمنگیں کہیں زنجیر کی پابند　　ہم قید ہیں زنداں میں بیاباں ہیں نظر میں

اِک ہستیِ بیدار کے دونوں ہیں کرشمے　　موجوں میں روانی ہے جوانی ہے بشر میں

کچھ داغ گُناہوں کے ہیں کچھ اشک ندامت　　عبرت کا مُرقع ہے مرے دامنِ تر میں

مَے خانہ سے چلتا ہے یہاں سکۂ جمہور　　سب شاہ و گدا ایک ہیں رندوں کی نظر میں

گُلشن سے نہ خوش جائے گا شبنم کا مسافر　　ہنس ہنس کے رُلانے کی ہے عادت گُلِ تر میں

روشن دلِ ویراں ہے محبت سے وطن کی
یا جلوۂ مہتاب ہے اُجڑے ہوئے گھر میں

نہیں منظور جینا روشناسِ چارہ گر ہو کر — رہے گا پاسِ غیرت پردۂ زخمِ جگر ہو کر

شباب آخر ہے بزمِ عیش کی بس یاد باقی ہے — جوانی خواب میں آتی ہے اب شمعِ سحر ہو کر

قفس کی آڑ سے محروم ہیں ہم آشیاں کیسا — پڑے ہیں دور صحنِ باغ سے بے بال و پر ہو کر

جوانی میں اسی کو ابتدائے عشق کہتے ہیں — دوا کی فکر کرنا طالبِ دردِ جگر ہو کر

ازل کے دن مٹا دینا تھا اس مٹی کی مورت کو — جگائے جس نے فتنے آفرینش کے بشر ہو کر

نظر کے سامنے ہے شامِ ناکامی کا سناٹا — جوانی ولولوں کی ڈھل رہی ہے دوپہر ہو کر

جگہ خالی کریں غنچوں سے شبنم کا اشارہ ہے — چمن میں قافلہ اترے گا پھولوں کا سحر ہو کر

عدم سے آئے تھے دنیا میں کیا معلوم تھا ہم کو — رہے گا ساتھ سودا زندگی کا دردِ سر ہو کر

لئے دریا نے موتی گل شجر نے لال پتھر نے — خریدا ہم نے سودا دردِ الفت کا بشر ہو کر

طلوعِ صبح کیا ہے مرثیہ ہے رونقِ شب کا — اڑا ہے رنگِ رخِ مہتاب کا نورِ سحر ہو کر

مقدر دیکھنا شبنم کا پھولوں میں ہوئی پیدا — پیام آیا فنا کا جلوۂ نورِ سحر ہو کر

فرشتہ حسن کا بیدار کرنے ان کو آیا ہے — جوانی کی امنگیں سو رہی تھیں بے خبر ہو کر

یہی اک راستہ باقی تھا کیا اوجِ مراتب کا
بنے اہلِ نظر تم دشمنِ اہلِ ہنر ہو کر

آپ معشوق ہیں قاتل نہیں جلّاد نہیں
دل دکھانے کے لئے حُسن خداداد نہیں

اب رہائی کی تمنّا دلِ ناشاد نہیں
راستہ اپنے نشیمن کا مجھے یاد نہیں

یہ غلط ہے کہ ہمیں طرزِ فغاں یاد نہیں
اب وہ عالم ہے کہ گنجائشِ فریاد نہیں

زندگی تھی وہی یا اور کوئی عالم تھا
کیا کہیں اس سے زیادہ ہمیں کچھ یاد نہیں

بیڑیاں زیست کی کس طرح سے جلد کٹ جائیں
کیا کہوں میری طرح روح بھی آزاد نہیں

باغ میں جا کے مجھے اور قلق ہوتا ہے
پھول پتے بھی مرے دل کی طرح شاد نہیں

دل جو ویران ہوا ہو گئی دُنیا ویراں
کوئی گھر خوش نہیں بستی کوئی آباد نہیں

نغمۂ دردِ محبت ہے صدا سے خالی
کیا سُنے کوئی یہ نالہ نہیں فریاد نہیں

سُنتے ہیں روح گھری رہتی ہے ارمانوں سے
مر کے بھی چین کی صورت دلِ ناشاد نہیں

پاسِ ناموس ہے غارت گرِ سودائے شباب
دل ہے مٹی اگر اس روگ سے آزاد نہیں

اُس کو بے درد گرفتارِ جنوں کہتے ہیں
جس کو دُنیا کی غلامی کا سبق یاد نہیں

سبزۂ باغ سے کہتی ہیں یہ شاخیں جھک کر
سر اُٹھانے کی جگہ گلشنِ ایجاد نہیں

جب کوئی ظلم نیا کرتے ہیں فرماتے ہیں
اگلے وقتوں کے ہمیں طرزِ ستم یاد نہیں

قدر داں کیوں مجھے تکلیفِ سخن دیتے ہیں
میں سخنور نہیں شاعر نہیں اُستاد نہیں

زندگی تلخیٔ ایّام کا افسانہ ہے زہر بھرنے کے لئے عمر کا پیمانہ ہے

مے جوانی ہے مری دل مرا میخانہ ہے یاں صراحی ہے نہ شیشہ ہے نہ پیمانہ ہے

بے حجاب آج تری نرگسِ مستانہ ہے اب جسے ہوش کا سودا ہے وہ دیوانہ ہے

رُخ ہے ساقی کی طرف ہاتھ میں پیمانہ ہے رہنما آج مری لغزشِ مستانہ ہے

نظر آتا ہے فقیری میں تماشائے جہاں ٹھیکرا بھیک کا جمشید کا پیمانہ ہے

آئی ہے لاش اُٹھانے کو نسیمِ سحری چھوٹتا بعدِ فنا شمع سے پروانہ ہے

عالمِ یاس میں دریا سے یہ کہتا ہے حباب غیر سیراب ہیں خالی مرا پیمانہ ہے

آتشِ شمع بھی کافور ہے اُس کے آگے دل میں جو آگ چھپائے ہوئے پروانہ ہے

لے چلی بزم سے کس وقت مجھے مرگِ شباب لب تک آیا بھی نہیں ہاتھ میں پیمانہ ہے

یاد اُمنگوں کی دلاتا ہے یہ اُجڑا ہوا دل میری بستی کی نشانی یہی ویرانہ ہے

یادِ احباب گذشتہ پہ فدا رہتا ہے دلِ ناشاد بھی شمعِ کا پروانہ ہے

دل ہے مایوس کہ نیّت نہیں ساقی کی درست آنکھ کہتی ہے یہ شیشہ ہے وہ پیمانہ ہے

اِک طرف جان ہے، پیمان وفا ایک طرف

امتحان آج ترا ہمّتِ مردانہ ہے

فکر مینا کیوں ہے ساقی کیوں تلاشِ جام ہے ۔۔۔ تو لگا دے منہ سے خم پینا ہمارا کام ہے

مجھ سے روشن ان دنوں دیر و حرم کا نام ہے ۔۔۔ پاے بت پر ہے جبیں لب پر خدا کا نام ہے

جن کو پیغامِ ستم خالی اجل کا نام ہے ۔۔۔ ان سے پوچھے کوئی اس دنیا میں کیا آرام ہے

عاشقوں کا اور رندوں کا ہجومِ عام ہے ۔۔۔ ہے گنہگاروں کا میلہ حشر جس کا نام ہے

صبح کو شبنم کے موتی باغ میں چوری گئے ۔۔۔ پھول کرنوں سے یہ کہتے ہیں تمھارا کام ہے

دیکھنا ہیں حسن کے جلوے تو بتخانے میں آ ۔۔۔ تیرے کعبہ میں تو بس واعظ خدا کا نام ہے

ہو گیا ہوں ساری دنیا کے گناہوں میں شریک ۔۔۔ جب سے میں نے یہ سنا ہے اس کی رحمت عام ہے

نشہ میں آزاد بیٹھا ہوں جہاں کی فکر سے ۔۔۔ گردشِ ساغر پہ صدقے گردشِ ایام ہے

تیرے دل میں اور میرے دل میں ہے واعظ یہ فرق ۔۔۔ وہ چراغِ صبح ہے اور یہ چراغِ شام ہے

لے اڑے گا نشۂ مے آج رندوں کو ضرور ۔۔۔ اک پری شیشہ میں ہے یا بادۂ گلفام ہے

لطفِ آزادی تھا جن سے چل بسے وہ ہمصفیر ۔۔۔ اب چمن کی صبح بھی مجھ کو قفس کی شام ہے

کفر ہے اس کی شکایت جس نے دل پیدا کیا ۔۔۔ دل سے جو پیدا ہوئی وہ آرزو بدنام ہے

شرط ہے پی کر مکرنا پارسائی کے لئے ۔۔۔ جو سرِ بازار پیتا ہے وہی بدنام ہے

میرے مذہب میں ہے واعظ ترکِ مے نوشی حرام ۔۔۔ چھوڑ کر پیتا ہوں پھر توبہ اسی کا نام ہے

لطف شاہی کی تمنا غیر کے دل میں رہے ۔۔۔ ہم فقیروں ہی سے زندہ لکھنؤ کا نام ہے

فکرِ دنیائے دنی ہے دشمنِ فکرِ سخن ۔۔۔ اس کشاکش میں غزل کہنا ہمارا کام ہے

کیا کونپلیں دکھاتی ہیں عالم اُبھار کا
آنچل سرک گیا ہے عروسِ بہار کا

ہم مر مٹوں کو ہے یہی موسم بہار کا
دو چار دن ہرا رہے سبزہ مزار کا

یاں چاندنی دکھاتی ہے اُمید کی جھلک
دریا کی لہر دل ہے کسی بے قرار کا

پھولوں کی جھولیوں میں ہیں موتی بھرے ہوئے
شبنم لُٹا رہی ہے خزانہ بہار کا

افسردہ خاطرانِ چمن کو خبر نہیں
آیا بھی اور گیا بھی زمانہ بہار کا

پھیلی ہو جیسے گورِ غریباں میں چاندنی
عالم یہ ہے خوشی میں دلِ داغ دار کا

شب کو بہار پردۂ شبنم میں روگئی
انجام سوچ کر چمنِ روزگار کا

دُنیا پہ اپنا حُسن جتانے کے واسطے
احساں لیا ہے روح نے مُشتِ غبار کا

وہ دِن گئے کہ تجھ سے لرزتے تھے اے اجل
اب زندگی ہے نام ترے انتظار کا

وہ آئیں بے پیئے جنھیں رہتی ہے بے خودی
محفل میں اپنی کام نہیں ہوشیار کا

افشا ہُوا نہ جورِ قضا و قدر کا راز
پردہ اُٹھا نہ مصلحتِ کردگار کا

غُنچے عدم سے آئے ہیں پہنے ہوئے کفن
انجام ہے نظر میں دو روزہ بہار کا

آئے ہیں پھول باغ میں ساغر لئے ہوئے
برسے شراب - ہے یہ اشارہ بہار کا

مٹّی ہیں گُل جو اور کسی بوستاں کے ہیں
کانٹے عزیز گُلشنِ ہندوستاں کے ہیں

ہم سوچتے ہیں رات کو تاروں کو دیکھ کر
شمعیں زمین کی ہیں جو داغ آسماں کے ہیں

صحنِ چمن سے دور اُنھیں باغباں نہ پھینک
تنکے جو یادگار مرے آشیاں کے ہیں

جنّت میں خاک بادہ پرستوں کا دل لگے
نقشے نظر میں صحبتِ پیرِ مغاں کے ہیں

اپنا مقام شاخِ بریدہ ہے باغ میں
گُل ہیں مگر ستائے ہوئے باغباں کے ہیں

اِک سلسلہ ہوس کا ہے انساں کی زندگی
اِس ایک مُشتِ خاک کو غم دو جہاں کے ہیں

قِصّے لکھے ہوئے ہیں جو فرہاد و قیس کے
کھوئے ہوئے ورق وہ مری داستاں کے ہیں
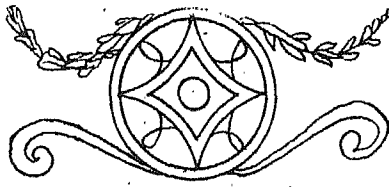
شورشِ دیر و حرم سے جب پریشاں ہو گئے
کچھ سمجھ کر ہم شریکِ بزمِ رنداں ہو گئے

حُسن کے پردہ میں کیا کیا عیب پنہاں ہو گئے
طُرۂ دستارِ گُل تارِ گریباں ہو گئے

دیکھنا نیرنگ سازیٔ طلسمِ نو بہار
پیرہن کلیوں کے پھولوں کے گریباں ہو گئے

مُفلسی میری محبت کی کسوٹی بن گئی
ہمّتِ احباب کے جوہر نُمایاں ہو گئے

دردِ اُلفت زندگی کے واسطے اکسیر ہے
خاک کے پُتلے اسی جوہر سے انساں ہو گئے

عطر افشاں میرے ویرانے میں آئی ہے نسیم
کیا کسی محبوب کے گیسو پریشاں ہو گئے

رہ گئی بازارِ محشر میں گنہگاروں کی ساکھ
رحمتِ باری کے سکّے داغِ عصیاں ہو گئے

چار دیوارِ چمن میں کیا دھرا ہے باغباں
دیکھ کوسوں تک ہرے کوہ و بیاباں ہو گئے

اپنے دیوانوں سے ملنے کو چلی آئی بہار
سبزہ و گُل صحنِ زنداں میں نُمایاں ہو گئے

زندگی میری اسیری کی فقط تمہید ہے
دام میں دانے مری قسمت کے پنہاں ہو گئے

اِس تمنّا میں کہ آزادی کی دیکھیں گے سحر
ہم اسیرِ کُلفتِ شبہائے زنداں ہو گئے

حُسن کی دولت سے تھے گُلہائے نورس بے خبر
دیکھ کر رنگِ بدچمن کانٹے نگہباں ہو گئے

جام تک خُم سے شراب آنے میں ہو جاتی ہے دیر
ہم تو ساقی کے تکلّف سے پریشاں ہو گئے

مے کے قطرے کیا تھے جب تک خُم میں تھے ساغر میں تھے
میرے ہونٹوں تک پہونچنا تھا کہ طوفاں ہو گئے

جن کی شورش کے لئے آغوشِ دنیا تنگ تھا
اشک کے قطرے وہ ان آنکھوں میں پنہاں ہو گئے

شرکتِ غم کا عزیزوں میں جو دستور نہیں
امتحاں ان کی وفا کا مجھے منظور نہیں

کیوں رُلانے کو سُناتے ہو وفا کے قصّے
دیکھتو اب تو محبّت کا یہ دستور نہیں

تپشِ شوق کو موسیٰ کی نظر ہے درکار
ورنہ دُنیا میں تجلّی نہیں یا طور نہیں

کس جواں مرگ کا دُنیا سے ہوا شب کو سفر
یہ سپیدی ہے کفن کی سحر نُور نہیں

ختم ہوتا نہیں کیوں ہستیٔ ناشاد کا راگ
پا بہ گِل جسم سہی روح تو مجبور نہیں

شہرۂ خاص کا طالب جو ہوا انساں ہے وہی
ورنہ شیطان سے زیادہ کوئی مشہور نہیں

دار سونی ہے فقط نعرہ زنی باقی ہے
مست و مجذوب ہیں لاکھوں کوئی منصور نہیں

شام سے صبح تلک جام رہے گردش میں
کرمِ پیرِ خرابات سے کچھ دور نہیں
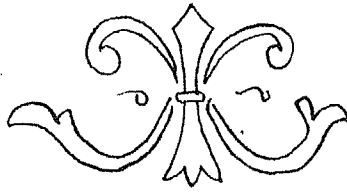
سنہ ۱۹۱۲ء

دل کئے تسخیر بخشا فیضِ روحانی مجھے
حُبِّ قومی ہوگیا نقشِ سُلیمانی مجھے

منزلِ عبرت ہے دُنیا اہلِ دُنیا شاد ہیں
ایسی دل جمعی سے ہوتی ہے پریشانی مجھے

جانچتا ہوں وسعتِ دل حملۂ غم کے لئے
امتحاں ہے رنج و حرماں کی فراوانی مجھے

حق پرستی کی جو میں نے بُت پرستی چھوڑ کر
برہمن کہنے لگے الحاد کا بانی مجھے

کُلفتِ دُنیا مٹے بھی تو سخی کے فیض سے
ہاتھ دھونے کو ملے بہتا ہوا پانی مجھے

خود پرستی مٹ گئی قدرِ محبت بڑھ گئی
ماتمِ احباب ہے تعلیمِ روحانی مجھے

قوم کا غم مول لے کر دل کا یہ عالم ہوا
یاد بھی آتی نہیں اپنی پریشانی مجھے

ذرّہ ذرّہ ہے مِرے کشمیر کا مہماں نواز
راہ میں پتھر کے ٹکڑوں نے دیا پانی مجھے

لکھنؤ میں پھر ہوئی آراستہ بزمِ سخن
بعد مدّت پھر ہوا شوقِ غزل خوانی مجھے

سنہ ۱۹۱۱ء

دردِ دل پاسِ وفا جذبۂ ایماں ہونا
آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا

نو گرفتارِ بلا طرزِ فغاں کیا جانیں
کوئی ناشاد سکھادے انھیں نالاں ہونا

چاک ہو کر کفنِ غنچہ بنا جامۂ گُل
کھُل گیا رنج سے شادی کا نمایاں ہونا

رہ کے دُنیا میں ہے یوں ترکِ ہوس کی کوشش
جس طرح اپنے ہی سایہ سے گریزاں ہونا

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

دفترِ حُسن پہ مُہرِ یدِ قدرت سمجھو
پھول کا خاک کے تودے سے نُمایاں ہونا

دل اسیری میں بھی آزاد ہے آزادوں کا
ولولوں کے لئے ممکن نہیں زنداں ہونا

گُل کو پامال نہ کر لعل و گُہر کے مالک
ہے اسے طرّہ دستارِ غریباں ہونا

ہے مرا ضبطِ جنوں جوشِ جنوں سے بڑھ کر
ننگ ہے میرے لئے چاک گریباں ہونا

قیدِ یوسف کو زلیخا نے کیا کُچھ نہ کیا
دلِ یوسف کے لئے شرط تھا زنداں ہونا

سنہ ۱۹۱۱ء
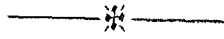
دل ہی بُجھا ہوا ہو تو لُطفِ بہار کیا
ساقی ہے کیا شراب ہے کیا سبزہ زار کیا

یہ دل کی تازگی ہے وہ دل کی فسردگی
اس گلشنِ جہاں کی خزاں کیا بہار کیا

کِس کے فسونِ حُسن کا دُنیا طلسم ہے
ہیں لوحِ آسماں پہ یہ نقش و نگار کیا

اپنا ہی دم ہوا ہے گلوگیر وقتِ نزع
غیروں کا زندگی میں ہو پھر اعتبار کیا

دیکھا سرورِ بادۂ ہستی کا خاتمہ
اب دیکھیں رنگ لائے اجل کا خُمار کیا

اب کی تو شامِ غم کی سیاہی کُچھ اور ہے
منظور ہے تجھے مرے پروردگار کیا

دُنیا سے لے چلا ہے جو توحسرتوں کا بوجھ
کافی نہیں ہے سر پہ گُناہوں کا بار کیا

جس کی قفس میں آنکھ کُھلی ہو مری طرح
اُس کے لئے چمن کی خزاں کیا بہار کیا

کیسا ہوائے حرص میں برباد ہے بشر
سمجھا ہے زندگی کو یہ مُشتِ غُبار کیا

خلعت کفن کا ہم تو زمانہ سے لے چکے
اب ہے عروسِ مرگ تجھے انتظار کیا

بعدِ فنا فضول ہے نام و نشاں کی فکر
جب ہم نہیں رہے تو رہے گا مزار کیا

اعمال کا طلسم ہے نیرنگِ زندگی
تقدیر کیا ہے گردشِ لیل و نہار کیا

چلتی ہے اس چمن میں ہوا انقلاب کی
شبنم کو آئے دامنِ گُل میں قرار کیا

تفسیرِ حالِ زار ہے بس اک نگاہِ یاس
ہو داستانِ درد کا اور انتصار کیا

دونوں کو ایک خاک سے نشو و نُما ملی
لیکن ہوائے دہر سے گُل کیا ہے خار کیا

چھٹکی ہوئی ہے گورِ غریباں پہ چاندنی
ہے بےکسوں کو فکرِ چراغِ مزار کیا

کچھ گُل نہاں ہیں پردۂ خاکِ چمن میں بھی
تازہ کرے گی اِن کو ہوائے بہار کیا

راحت طلب کو درد کی لذّت نہیں نصیب
تلوؤں میں آبلے جو نہیں لُطفِ خار کیا

خاکِ وطن میں دامنِ مادر کا چین ہے
تنگی کنار کی ہے لحد کا فشار کیا

انساں کے بغض و جہل سے دُنیا تباہ ہے
طوفاں اُٹھا رہا ہے یہ مُشتِ غبار کیا

دل ہی کی بدولت رنج بھی ہے دل ہی کی بدولت راحت بھی
یہ دُنیا جس کو کہتے ہیں ہے دوزخ بھی ہے اور جنّت بھی

ارمان بھرے دل خاک ہوئے اور موت کے طالب جیتے ہیں
اندھیر یہ اس دُنیا کے ہمیں آتی ہے ہنسی اور رقّت بھی

یا خوفِ خُدا یا خوفِ سقر ہیں دو ہی بیان ترے واعظ
اللہ کے بندے دل میں ترے ہے سوز و گدازِ محبّت بھی

جب تک ہے جوانی کا عالم کیا عیش کی مستی رہتی ہے
جب پیری موت کی لائی خبر پھر زہد بھی ہے اور طاعت بھی

گرتے ہی زمیں کے دامن میں اے طفل یہ رونا دھونا کیا
دُنیا میں اگر تو آیا ہے یاں رنج بھی ہے اور راحت بھی

سنہ ۱۹۱۲ء

نئے جھگڑے نرالی کاوشیں ایجاد کرتے ہیں
وطن کی آبرو اہلِ وطن برباد کرتے ہیں

ہوا میں اُڑ کے سیرِ عالمِ ایجاد کرتے ہیں
فرشتے دنگ ہیں وہ کام آدم زاد کرتے ہیں

نیا مسلک نیا رنگِ سخن ایجاد کرتے ہیں
عروسِ شعر کو ہم قید سے آزاد کرتے ہیں

متاعِ پاسِ غیرت بوالہوس برباد کرتے ہیں
لبِ خاموش کو شرمندۂ فریاد کرتے ہیں

ہوائے تازہ پا کر بوستاں کو یاد کرتے ہیں
اسیرانِ قفس وقتِ سحر فریاد کرتے ہیں

ذرا اے کنجِ مرقد یاد رکھنا اس حمیّت کو
کہ گھر ویران کر کے ہم تجھے آباد کرتے ہیں

ہر اک خشتِ کہن افسانۂ دیرینہ کہتی ہے
زبانِ حال سے ٹوٹے کھنڈر فریاد کرتے ہیں

بلائے جاں ہیں یہ تسبیح اور زنّار کے پھندے
دلِ حق بیں کو ہم اس قید سے آزاد کرتے ہیں

اذاں دیتے ہیں بتخانہ میں جا کر شانِ مومن سے
حرم میں نعرۂ ناقوس ہم ایجاد کرتے ہیں

نکل کر اپنے قالب سے نیا قالب بسائے گی
اسیری کے لئے ہم روح کو آزاد کرتے ہیں

محبّت کے چمن میں مجمعِ احباب رہتا ہے
نئی جنّت اسی دُنیا میں ہم آباد کرتے ہیں

نہیں گھٹتی مری آنکھوں میں تاریکی شبِ غم کی
یہ تارے روشنی اپنی عبث برباد کرتے ہیں

تھکے ماندے مسافر ظلمتِ شامِ غریباں میں
بہارِ جلوۂ صبحِ وطن کو یاد کرتے ہیں

دلِ ناشاد روتا ہے زباں اُف کر نہیں سکتی
کوئی سُنتا نہیں یوں بینوا فریاد کرتے ہیں

جنابِ شیخ کو یہ مشق ہے یادِ الہٰی کی
خبر ہوتی نہیں دل کو زباں سے یاد کرتے ہیں

نظر آتی ہے دُنیا اک عبادت گاہ نورانی
سحر کا وقت ہے بندے خُدا کو یاد کرتے ہیں

سبق عمرِ رواں کا دل نشیں ہونے نہیں پاتا
ہمیشہ بھولتے جاتے ہیں جو کچھ یاد کرتے ہیں

زمانہ کا معلّم اِمتحاں اِن کا نہیں کرتا
جو آنکھیں کھول کر یہ درسِ ہستی یاد کرتے ہیں

ادب تعلیم کا جوہر ہے زیور ہے جوانی کا
وہی شاگرد ہیں جو خدمتِ اُستاد کرتے ہیں

نہ جانی قدر تیری عمرِ رفتہ ہم نے کالج میں
نکل آتے ہیں آنسو اب تجھے جب یاد کرتے ہیں

عہ یہ غزل کیننگ کالج کے مشاعرہ میں پڑھی گئی تھی۔

۱۹۱۱ء

قوم کی شیرازہ بندی کا گلہ بے کار ہے | طرزِ ہندو دیکھ کر رنگِ مسلماں دیکھ کر
دیدنی ہے بیخودی وارفتگانِ شوق کی | ہنس رہے ہیں خود بخود چاکِ گریباں دیکھ کر
انتشارِ قوم سے جاتی رہی تسکینِ قلب | نیند رخصت ہوگئی خوابِ پریشاں دیکھ کر

شاد ہیں ناشاد ہیں یا خانماں برباد ہیں | ہم سے اچھے ہیں کہ یہ وحش و طیور آزاد ہیں
آب و دانہ سے قفس کے کچھ ہمیں اُلفت نہیں | بے پر و بالی سے اپنی عاشقِ صیاد ہیں

پر لگے تہذیب کو کشتیٔ نو ایجاد سے | خدمتِ آبِ رواں لیتا ہے انساں باد سے

۱۹۱۱ء

رفتہ رفتہ یہ بڑھا جلوۂ تاثیرِ بہار | سبز پوشانِ چمن بن گئے تصویرِ بہار
بس ترا حُسن رہا قیدِ لوازم سے بری | پیکرِ گُل کو پنھائی گئی تصویرِ بہار
دیکھنا خامۂ قدرت کی یہ رنگ آمیزی | ورقِ گُل پہ لِکھا نامۂ تقدیرِ بہار
صبحدم آئینۂ آب میں ہے عکسِ چمن | کھینچ دی ہے یہ قدرت نے یہ تصویرِ بہار
سیکڑوں پھول کھلے پر نہ کھلی دل کی کلی | ہم قفس میں نہیں شرمندۂ تاثیرِ بہار

عکسِ مہ قطرۂ شبنم میں ہے شبنم گُل پر　　　پردۂ شب میں چمک اُٹھی ہے تقدیر بہار

پردۂ خاک سے گُل جام بکف نکلا ہے

مے کی تاثیر سے کچھ کم نہیں تاثیر بہار
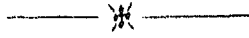
مے جوانی ہے مری دل مرا میخانہ ہے　　　یاں صراحی ہے نہ شیشہ ہے نہ پیمانہ ہے

دلِ مایوس میں کیفیتِ اُمید کہاں　　　مے کے قابل نہیں ٹوٹا ہوا پیمانہ ہے
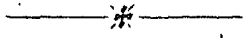
دوست مرنے پہ مرے داد وفا دیتے ہیں　　　ہائے کس وقت محبت کا صلہ دیتے ہیں

دشمنوں سے بھی مجھے ترک وفا مشکل ہے　　　دوست بن کر مجھے کم بخت دغا دیتے ہیں
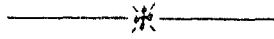
۱۹۱۱ء

اُڑا کر صحن گلشن سے۔ مٹا کر آشیاں میرا　　　میرے سایہ کے پیچھے پھر رہا ہے باغباں میرا

کسی کو کیا۔ موافق ہو گیا گر باغباں میرا　　　صبا میری چمن میرا چمن میں آشیاں میرا

مرے احباب پیش آتے ہیں مجھ سے بیوفائی سے　　　وفاداری میں شاید کر رہے ہیں امتحاں میرا

ہجومِ بیکسی ہے شامِ تنہائی ہے اور میں ہوں　　　صدائے چارہ گر برہم نہ کر دے یہ سماں میرا

تہ و بالا کیا ہے گردشِ اعمال نے مجھ کو　　　نہ دشمن ہے زمیں میری نہ دشمن آسماں میرا

صفائے قلب سے اللہ رے انساں کی عظمت　　فرشتے چومتے ہیں آ کے سنگِ آستاں میرا

مجھے دیر و حرم سے واسطہ کیا رند مشرب ہوں　　وہی ایماں ہے جو کچھ کہے پیرِ مغاں میرا

یہ ماتم ہے مصوّر اُٹھ گیا گلزارِ قدرت کا　　ہر اِک طائر ہر اِک برگِ چمن ہے نوحہ خواں میرا

نہ اگلی تازگی ہے اور نہ جدّت ہے جوانی کی　　پُرانا ہو گیا افسانۂ عمرِ رواں میرا

سفر میں زندگی کے سو گیا ہوں تھک کے منزل پر　　اجل کے نام سے بدنام ہے خوابِ گراں میرا

چمن کو چھوڑ دوں یہ بدنصیبی کا اشارہ ہے　　وہی مُرجھا گئی جس شاخ پر تھا آشیاں میرا

اسیری میں زباں سے میری سُن کر رازِ آزادی　　گریباں پھاڑ کر سر دُھن رہا ہے پاسباں میرا

الٰہی خیر ہو مَیں نے قفس میں خواب دیکھا ہے　　کہ شمعِ صحنِ گُلشن بن گیا ہے آشیاں میرا

وطن میں بے وطن مجھ کو کیا ہے اِک فسوں گر نے　　نہ مَیں ہندوستاں کا ہوں نہ ہے ہندوستاں میرا

تمنّا اب کسے باقی ہے اسرارِ معانی کی　　بہت لُٹتا رہا سرمایۂ لُطفِ بیاں میرا

الٰہی خیر ہو کیا سرگذشتِ دل سُنائے گا
لرزتا ہے مری آنکھوں میں کیوں اشکِ رواں میرا
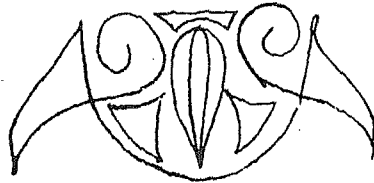
سنہ ۱۹۱۱ء

مُلک میں دولت نہیں باقی دوا کے واسطے
ہاتھ خالی رہ گئے ہیں اب دعا کے واسطے

خود پرستوں سے حبیبانِ وطن کا قول ہے
ہم وفا کے واسطے ہیں تم جفا کے واسطے

آب و آتش کی غلامی پر بشر قانع نہیں
ہو رہی ہے فکر تسخیرِ ہوا کے واسطے

مُردہ دل زندہ جفائے زندگی سہنے کو ہیں
مرنے والے مر گئے پاسِ وفا کے واسطے

رنج و راحت کا سبب دُنیا میں کچھ پایا نہیں
حشر میں ہم صاف کہدیں گے خُدا کے سامنے

گُل نہیں تو بوئے گُل ہی سے معطّر ہو دماغ
کوئی رکھدیتا قفس میرا ہوا کے سامنے

آشنا ہوں کان کیا انسان کی فریاد سے
شیخ کو فرصت نہیں مِلتی خُدا کی یاد سے
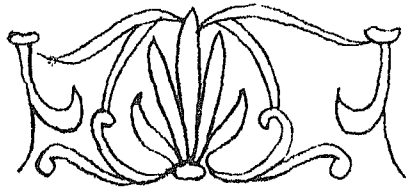
حیف جینے کی تو ایک آدھ گھڑی باقی ہے　　مے مرے حصّہ کی شیشہ میں بھری باقی ہے

موت کہتی ہے کہ لبریز ہے پیمانۂ عمر　　دوست کہتے ہیں کہ اُمّید ابھی باقی ہے

موت کے رنگ سے مِٹتا ہے کہیں رنگِ شباب　　زرد چہرہ پہ جوانی کی ہنسی باقی ہے

زندگی نام تھا جس کا اُسے کھو بیٹھے ہم　　اب اُمیدوں کی فقط جلوہ گری باقی ہے

ہل گئے سات طبق ہو گئی دُنیا ویراں　　مگر انساں کی ابھی بے خبری باقی ہے

میری نیکی تو مِرے ساتھ گئی دُنیا سے
کیا ابھی دل میں رقیبوں کے بدی باقی ہے

قطعہ
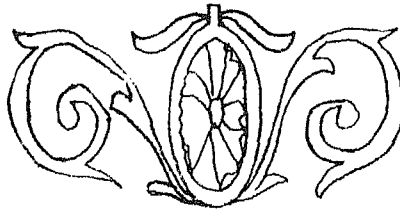
(الہ آباد کے ایک مشاعرہ سے غیر حاضری کا معذرت نامہ)

پا بہ زنجیر علالت سے ہوں مجبوری ہے
کششِ بزم سخن سے مجھے انکار نہیں

تنِ خاکی پر پرواز کہاں سے لائے
دل تڑپتا ہے قدم مائلِ رفتار نہیں

باکمالوں کی زیارت ہو تمنّا تھی یہی
ورنہ مجھ کو ہوسِ گرمیِ بازار نہیں

منزلِ عیش مجھے گوشۂ گمنامی ہے
دل وہ یوسف ہے جسے فکر خریدار نہیں

رونقِ بزم نہیں میرے قدم کی محتاج
فکر بے کار ہے پھولوں میں اگر خار نہیں

ذکر کیوں آئے گا بزمِ شعرا میں اپنا
مَیں تخلّص کا بھی دُنیا میں گنہگار نہیں

جلوۂ معرفت

(فلسفہ دید)

فیضِ قدرت سے جو تقدیر کھلی عالم کی
ساحلِ ہند پہ وحدت کی تجلّی چمکی

مٹ گئی جہل کی شب صبح کا تارا چمکا
آریہ ورت کی قسمت کا ستارا چمکا

اہلِ دل پر ہوئی کیفیتِ عرفاں طاری
جس سے دُنیا میں ہوئیں دین کی نہریں جاری

تھیں کھلی جلوہ گہِ خاص میں راہیں اُن کی
واقفِ رازِ حقیقت تھیں نگاہیں اُن کی

عرش سے اُن کے لئے نورِ خدا آیا تھا
بندۂ خاص تھے رشیوں کا لقب پایا تھا

وید اُن کے دلِ حق کیش کی تصویریں ہیں
جلوۂ قدرتِ معبود کی تفسیریں ہیں

عین کثرت میں یہ وحدت کا سبق ویدمیں ہے
ایک ہی نور ہے جو ذرّہ و خورشید میں ہے

جس سے انسان میں ہے جوشِ جوانی پیدا
اُسی جوہر سے ہے موجوں میں روانی پیدا

رنگ گلشن میں فضا دامنِ کہسار میں ہے
خوں رگِ گُل میں ہے نشتر کی خلش خار میں ہے

تمکنت حُسن میں ہے جوش ہے دیوانے میں
روشنی شمع میں ہے سوز ہے پروانے میں

رنگ و بو ہو کے سمایا وہی گلزاروں میں
ابر بن کر وہی برسا کیا کہساروں میں

شوق ہو کر دلِ مجذوب پہ چھایا ہے وہی
درد بن کر دلِ شاعر میں سمایا ہے وہی

نورِ ایماں سے جو پیدا ہو صفا سینے میں
عکس اس کا نظر آتا ہے اس آئینے میں

عہ یہ نظم ایک دوست کی فرمایش سے ایک مذہبی کتب خانہ کی لوح پر کندہ ہونے کے لئے تصنیف کی گئی تھی۔

قطعہ

کل سرِ شام مرے سامنے ایک مردِ بزرگ — عالمِ غیظ میں اس طرح ہوئے گرم سخن

آپ نے حضرتِ گرٹو عہ کا لڑکپن دیکھا — تج دیا خدمتِ کالج عہ کے لئے تن من دھن

کچھ سمجھ میں نہیں آتا یہ انھیں کیا سوجھی — کون ذی ہوش کہے گا اسے کارِ احسن

چھوڑ دی خواہشِ زر ترک کیا عیشِ شباب — گر یہ سنیاس نہیں ہے تو ہے کیا حضرتِ من

دولتِ علم بھی تھی دولتِ دُنیا بھی تھی — لہلہاتا تھا جوانی کی اُمنگوں کا چمن

رہتے سرگرمِ تجارت کہ وکالت کرتے — ہر طرح گوہرِ مقصود سے بھرتے دامن

پر عجب چیز ہے یہ آپ کا "حُبِّ قومی" — روشنی طبع کی ہو جاتی ہے برقِ خرمن

اور بھی پیر و جواں قوم میں ہیں صاحبِ زر — اپنے سر ایک بھی لیتا نہیں ایسی اُلجھن

فکرِ زر سے نہیں پیری میں بھی رہتے غافل — ترک کرتے ہیں وکالت نہ ہیں لیتے پنشن

خدمتِ قوم تو اک شغل ہے بے کاروں کا — یا جو مفلس ہیں مبارک رہے اُن کو یہ چلن

سُن کے یہ قصۂ بیدردیِ ابنائے زماں — یاد آئی مجھے اُستاد کی یہ بیتِ کہن

اے کہ آگاہ نئی حالتِ درویشاں را

تو چہ دانی کہ چہ سودا و سرست ایشاں را

عہ پنڈت اقبال نرائن گرٹو۔ عہ سنٹرل ہندو کالج بنارس۔

حصّۂ پنجم

(مشقِ ابتدائی کا کلام)

مرقعِ عبرت

۱۸۹۸ء

[تمہید]

ہاں نورِ ازل جلوۂ گفتار دکھادے　　ہاں شمعِ زباں مطلعِ انوار دکھادے
ہاں طبعِ رواں قلزمِ زخّار دکھادے　　ہاں رنگِ سخن گلشنِ بے خار دکھادے
گلزار معانی کا مہکتا نظر آئے
طوطی چمنستاں میں چہکتا نظر آئے

ہو حُسنِ بیاں میں چمنستاں کا تجمّل　　ہر نکتۂ رنگیں نظر آئے صفتِ گُل
ہر معنیٔ پیچیدہ بنے طرۂ سُنبل　　عاشق ہوں سخن پر جو سُنیں صورتِ بُلبُل
جو شعر ہو طوبےٰ کا وہ ثانی نظر آئے
کوثر کی طبیعت میں روانی نظر آئے

ع۵ یہ نظم انجمن نوجوانان کشمیر کے ایک سالانہ جلسہ میں کچھ عرصہ بعد پڑھی گئی۔

ہاں طبع رسا خاطرِ احباب ہے منظور — بس شرم کا برقع رُخِ معنی سے ہوا ب دور
دکھلا دے سرِ بزم تجلّیِ سرِ طور — غش صورتِ موسیٰ ہوں جو سُن پائیں یہ مذکور
منکر جو ہیں فرعوں صفت اعجازِ سخن کے
ہوں آج وہ قائل مرے اندازِ سخن کے

ہاں طعنہ و تشنیع کی پروا نہیں مجھ کو — تحسین و ستایش کی تمنّا نہیں مجھ کو
نیرنگیِ افلاک کا شکوا نہیں مجھ کو — کچھ فکر ہو شہرت کی یہ سودا نہیں مجھ کو
ڈوبا ہوا ہوں مثلِ سخن رنگِ سخن میں
گُل ہو کے میں رہتا ہوں لطافت کے چمن میں

اس وقت کا اب ہوش بھی پورا نہیں زنہار — سرمست مجھے رکھتی ہے جب سے مئے اشعار
لیکن نہ رہا مجھ کو تعلّی سے سروکار — ہے میری خموشی پہ فدا عالمِ گفتار
اس مے نے کچھ ایسا مجھے مدہوش کیا ہے
خود اپنے تئیں میں نے فراموش کیا ہے

عالم سے جُدا ہے مری تقریر کا عالم — بد بینوں پہ حیرت سے ہے تصویر کا عالم
رنگیں سخنی سے ہے یہ تحریر کا عالم — ہر صفحے پہ ہے گلشنِ کشمیر کا عالم
کیفیتِ گلزار سمائی ہے نظر میں
اس خطّۂ دل کش کا ہے سودا مرے سر میں

محتاج نہیں وصف کا یہ خطۂ دل گیر ۔۔۔ ہے رد کشِ گلزار جناں گلشنِ کشمیر
فردوسِ بریں اس کی ہے بگڑی ہوئی تصویر ۔۔۔ واں موج ہوا میں دمِ عیسیٰ کی ہے تاثیر

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر در آید
گر مرغِ کباب است کہ با بال و پر آید

[کشمیر]

پانی میں ہے چشموں کے اثر آبِ بقا کا ۔۔۔ ہر نخل پہ عالم خضرِ سبز قبا کا
جو پھول ہے گلشن میں وہ ہے نورِ خدا کا ۔۔۔ سائے میں شجر کے ہے اثر ظلّ ہما کا

مبدا ار کرم عام کی ہر جوے رواں ہے
سرچشمۂ فیضِ چمن آرائے جہاں ہے

وہ موج ہوا کا حرکت ابر کو دینا ۔۔۔ چشموں سے پہاڑوں کے وہ اُڑتا ہوا پھینا
گاتے ہوئے ملّاحوں کا وہ کشتیاں کھینا ۔۔۔ ڈل[1] کا وہ سرِ شام اِدھر کروٹیں لینا

وہ عکس چراغوں کا جھلکتا نظر آنا
پانی کا ستارہ بھی چمکتا نظر آنا

ہر لالۂ کہسار ہے شکلِ گلِ راحت ۔۔۔ داغ اُس کے ہیں خالِ رُخِ حوراے مسرّت
کیا سبزۂ خوش رنگ ہے سرمایۂ عشرت ۔۔۔ دل کے لئے ٹھنڈک ہے جگر کے لئے فرحت

---

[1] - ایک جھیل کا نام ہے۔

ایسا نہیں قدرت نے کیا فرش کہیں پر
اس رنگ کا سبزہ ہی نہیں روئے زمیں پر

"وہ صبح کو کہسار کے پھولوں کا مہکنا
وہ جھاڑیوں کی آڑ میں چڑیوں کا چہکنا
گردوں پہ شفق کوہ پہ لالے کا لہکنا
مستوں کی طرح ابر کے ٹکڑوں کا بہکنا
ہر پھول کی جُنبش سے عیاں نازِ پری کا
چلنا وہ دبے پاؤں نسیمِ سحری کا"

وہ طائرِ کہسار لبِ چشمۂ کہسار
وہ سرد ہوا وہ کرمِ ابرِ گہر بار
وہ میوۂ خوش رنگ وہ سرسبز چمن زار
اِک آن میں صحت ہو جو برسوں کا ہو بیمار
یہ باغِ وطن روکشِ گلزارِ جناں ہے
سرمایۂ نازِ چمن آرائے جہاں ہے

ہے خطۂ سرسبز میں اک نُور کا عالم
ہر شاخ و شجر پر شجرِ طور کا عالم
پروین ہے یہ ہے خوشۂ انگور کا عالم
ہر خار پہ بھی ہے مژۂ حور کا عالم
نِکلے نہ صدا ایسی مغنّی کے گلو سے
آتی ہے جو آوازِ ترنّم لبِ جُو سے

میووں سے گرانبار وہ اشجار کے ڈالے
بکھرے ہوئے وہ دامنِ کہسار پہ لالے
اُڑتے ہوئے بالائے ہوا برف کے جھالے
دیکھے جو کوئی دور سے ہیں روئی کے گالے

وہ ابر کے لکّوں کا تماشہ شجروں میں
جھرنوں کی صدائیں وہ پہاڑوں کے دروں میں

چھوٹے ہوئے اس باغ کو گذرا ہے زمانا　　تازہ ہے مگر اس کی محبّت کا فسانا
عالم نے شرف جن کی بزرگی کا ہے مانا　　اُٹھے تھے اسی خاک سے وہ عالم و دانا

تن جن کا ہے پیوند اب اس پاک زمیں کا
رگ رگ میں ہماری ہے رواں خون انھیں کا

ہاں میں بھی ہوں بلبل اُسی شاداب چمن کا　　ہے چشمۂ فردوس یہ عالم ہے دہن کا
کس طرح نہ سرسبز ہو گلزار سخن کا　　ہے رنگ طبیعت میں چمن زار وطن کا

تازے ہیں مضامین بھی طبیعت بھی ہری ہے
ہاں گلشنِ قومی کی ہوا سر میں بھری ہے

(قوم کی حالت)

ہے لب پہ مرے اُلفتِ قومی کا ترانہ　　آئینۂ کیفیتِ نیرنگِ زمانہ
ہاں گوش حقیقت سے سنیں عاقل و دانا　　تقدیر کی گردش کا یہ پُر درد فسانہ

کس اوج سے اس قوم کا یہ حال ہوا ہے
کس طرح یہ گلشن مرا پامال ہوا ہے

خاموش تھا جو لب وہی سرگرم فغاں ہے
جو آگ تھی سینے میں نہاں آج عیاں ہے
بسمل کی طرح خاطرِ ناشاد تپاں ہے
ہر دم نفس صورتِ شمشیر رواں ہے

"لختے بر داز من گذرد ہر کہ زپیشم
من قاش فروشِ دلِ صدپارۂ خویشم

ہے قوم پہ چھایا ہوا یہ ابرِ نحوست
نظروں سے ہے پنہاں رُخِ خورشید سعادت
میدانِ ترقی سے قدم کرتے ہیں رجعت
سائے کی طرح ساتھ ہے ادبار کی صورت

وہ بارِ الم ہے کہ اُٹھایا نہیں جاتا
بگڑا ہے وہ نقشہ کہ بنایا نہیں جاتا

پیروں میں نہیں روشنیٔ چشمِ بصیرت
عنقا ہے جوانوں میں جوانمردی و ہمت
گمراہ ہوئے جاتے ہیں خود خضرِ طریقت
ہر صفحۂ دل سے ہے مٹا حرفِ محبت

باقی ہے کہاں نام و نشاں مہر و وفا کا
کچھ رنگ ہی بدلا نظر آتا ہے ہوا کا

[نو جوانوں کی حالت]

موجود ہے جن بازوؤں میں زورِ جوانی
طوفاں سے اُنھیں کشتیٔ قومی ہے بچانی
پر ہے جو غفلت سے سروں میں یہ گرانی
آرام پسندی میں یہ رکھتے نہیں ثانی

پہلو میں کسی کے دل دیوانہ نہیں ہے

ہیں مرد مگر ہمّتِ مردانہ نہیں ہے

عبرت نہیں دیتا انھیں نیرنگ زمانہ — عمر ان کی فقط لہو ولعب کا ہے فسانہ

تعلیم کہاں اور کہاں صحبتِ دانا — بس پیشِ نظر رہتا ہے آئینہ وشانہ

گہ رُخ پہ گہے موئے پریشاں پہ نظر ہے

اک شغل یہی ان کے لئے شام وسحر ہے

مٹّی میں یہ قدرت کے عطئے ہیں ملاتے — کچھ نشو ونُما جوہرِ ذاتی نہیں پاتے

عزّت جو بزرگوں کی ہے وہ بھی ہیں گنواتے — بازاروں میں دولت ہیں جوانی کی لُٹاتے

کاشانۂ تہذیب سنورتا نہیں دم بھر

وہ نشہ چڑھا ہے کہ اُترتا نہیں دم بھر

پاسِ ادب وحُسن لیاقت نہیں رکھتے — پاکیزہ وپُرجوش طبیعت نہیں رکھتے

آنکھوں کے لئے سُرمۂ عبرت نہیں رکھتے — دل رکھتے ہیں پر دردِ محبّت نہیں رکھتے

کیا غم چمنِ قوم ہے ویراں کہ ہرا ہے

نخوت کی ہوا سے سرِ شوریدہ بھرا ہے

ہمّت نہیں لیکن دلِ پُرجوش پہ نازاں — بیہوش وخرد ہیں خرد وہوش پہ نازاں

بدشکل ہوں پر چشم ولب وگوش پہ نازاں — کم ظرف کوئی اپنے تن وتوش پہ نازاں

نیرنگیِ افلاک کا ڈر ان کو نہیں ہے
فرعون ہیں موسیٰ کی خبر ان کو نہیں ہے

مُفلس ہیں مگر خبط امیروں سے سوا ہیں
اچھّے یہ اسیر قفسِ حرص و ہوا ہیں
ناموس کے طالب ہیں نہ پابند حیا ہیں
سیرت سے غرض کچھ نہیں صورت پہ فدا ہیں

پروا نہیں مانگے کا اگر جامۂ تن ہو
سودا ہے تو یہ ہے کہ نہ دامن پہ شکن ہو

خود شان پہ یاست میں ہوئے جاتے ہیں برباد
گو حجرۂ کلفت میں کُڑھے مادر ناشاد
دیکھے نہ سُنے خلق میں اس طرح کے آزاد
کیا باعثِ عبرت ہوا کفیں قوم کی فریاد

جو شرم سے میلے نہ ہوں تیور ہیں یہ ان کے
"دل رکھتے ہیں فولاد کا جوہر ہیں یہ ان کے"

بس نفس پرستی کو سمجھتے ہیں یہ راحت
حِصّے میں نہیں ان کے جوانی کی لطافت
وہ جوہر عالی ہیں نہ وہ حُسن لیاقت
جن سے کہ ہے پاتی پر پرواز طبیعت

آتا ہے نظر اور سماں ارض و سما میں
اُڑتا ہے بشر عالمِ بالا کی ہوا میں

رگ رگ میں وہ بجلی کی طرح خوں کی روانی
ہر موئے بدن جس سے رگِ جاں کا ہو ثانی
اللہ رے بہار چمنستانِ جوانی
چلتی نہیں بھولے سے یہاں بادِ خزانی

تعریف ہو کیا اس چمنستاں کے ثمر کی
کانٹے میں بھی جس کے ہے نزاکت گُلِ تر کی

لیکن نہیں یہ تازہ ثمر اِن کو میسّر — تعریف میں جس کی ہے فرشتوں کی بات
گو باغِ جوانی کی ہوا کے ہیں یہ خوگر — پھولوں سے نہیں بس کے دماغ ان کا معطّر

در پیش انھیں عالمِ غربت ہے وطن میں
بیگانہ ہیں سبزے کی طرح رہ کے چمن میں

جو صاحبِ تہذیب ہیں اور صاحبِ جوہر — اُن میں بھی نہیں قوم کے ہمدرد میسّر
ہے سر میں ہوا حرص کی دل میں ہوسِ زر — نے مُلک کے حامی ہیں نہ ہیں قوم کے رہبر

بس زر کی پرستش انھیں فرضِ ازلی ہے
بُت ہے تو یہی ہے جو خُدا ہے تو یہی ہے

[دولت]

کہتے تھے بُرا زر کو سخن سنج پُرانے — اُن لوگوں کے ہمراہ گئے اُن کے زمانے
وہ فلسفہ و علم و ادب اب ہیں فسانے — بدلا ہے نیا رنگ زمانے کی ہوا نے

دولت سے ہے اب زینتِ کاشانۂ تہذیب
کہتے ہیں اسے شمعِ جلو خانۂ تہذیب

مٹ جانے پہ بھی نام و نشاں رہتا ہے اس سے — سرچشمۂ اُمید رواں رہتا ہے اس سے

تازہ چمنِ تاب و تواں رہتا ہے اس سے — پیری میں بھی انساں جواں رہتا ہے اس سے

ہر رنگ میں یہ تازگیِ قلب و جگر ہے

ہے صلح میں شمشیر لڑائی میں سپر ہے

کوشش کبھی زردار کی جاتی نہیں بے سود — رہتا ہے سدا سایہ فگن طالعِ مسعود

انسان کی نیت میں اگر شر نہ ہو موجود — زر ہاتھ میں اس کے ہے کلیدِ درِ مقصود

کب گوہرِ اُمید کو رولا نہیں اس نے

تھا کون سا در بند جو کھولا نہیں اس نے

ہوں طالبِ تحقیق کہ دلدادۂ تعلیم — خم سامنے دولت کے ہے سب کا سرِ تسلیم

سنتے ہیں انھیں کے لئے ہیں کوثر و تسنیم — یاں جو رہِ مولا میں لٹاتے ہیں زر و سیم

دُنیا ہی میں کچھ ذکر نہیں تازہ ہے اس کا

دربار میں اللہ کے آوازہ ہے اس کا

لیکن وہ زر و مال نہیں قابلِ تحسیں — انساں کو بنا دے جو تکبر پرور و خود بیں

زردار وہ ہے جس میں شرافت کے ہوں آئیں — ہو بزمِ محبت کے لئے باعثِ تزئیں

سرسبز رہے قوم یہ انعام ہو اس کا

باراں کی طرح فیضِ کرم عام ہو اس کا

مانا ہوسِ زر ہے بشر کے لئے عادت　　لیکن نہیں دُنیا میں فقط اِک یہی نعمت
کچھ اور بھی جوہر ہیں عطا کردۂ قدرت　　غمخواری و دلجوئی و ہمدردی و الفت

زر آپ نہیں دشمنِ اخلاق و ادب ہے
جو حد سے گذر جاتی ہے وہ اس کی طلب ہے

جو لوگ مئے حرص سے دُنیا میں ہیں سرشار　　جینے کی لطافت سے نہیں اُن کو سروکار
مانندِ گدا زر کے ہیں ہر وقت طلبگار　　آزاد کہاں دامِ طمع میں ہیں گرفتار

محروم مئے عیش سے یہ خستہ جگر ہیں
مالک یہ نہیں زر کے فقط بندۂ زر ہیں

دولت وہ ہے مجبور کی جو عقدہ کُشا ہو　　اکسیر ہو دردِ دلِ بیکس کی دوا ہو
آئینۂ اخلاق و محبت کی جِلا ہو　　ظلماتِ فلاکت کے لئے آبِ بقا ہو

یوں فیض کے چشمے ہوں رواں باغِ وطن میں
جیسے کرمِ ابرِ گہر بار چمن میں

ہر صبح گلستاں میں بصد شانِ فصاحت　　بُلبُل گلِ رنگیں سے یہ کرتی ہے حکایت
دیکھو چمن آرائے دوعالم کی عنایت　　گھٹتے کبھی دیکھی نہیں فیّاض کی دولت

گو کم دُرِ خوش آب لُٹانا نہیں ہوتا
خالی کبھی شبنم کا خزانہ نہیں ہوتا

مانا سبب شوکت و اجلال ہے دولت   پر مفلس بیکس بھی نہیں قابلِ نفرت
ادنیٰ سے ملے جھک کے یہ اعلیٰ کی ہے عظمت   بس نشۂ زر سے نہ جھکے چشمِ مروّت

ہے کبر اسے شان امارت نہیں کہتے
کچھ کہئے اسے حسن شرافت نہیں کہتے

کس اوج پہ خورشید جہاں تاب ہے معمور   دل تیرگیٔ کبر سے کوسوں ہے مگر دور
گو خاک نہیں ذرّۂ ناچیز کا مقدور   دیتا ہے اسے جام سے اپنے وہ مۓ نور

یا ماہ کا اس اوج پہ کیا فیض عیاں ہے
ہر خانۂ مفلس کے لئے شمع مکاں ہے

یا باغ میں کھلتا ہے دمِ صبح گُلِ تر   کیا کیا اسے ہوتے نہیں اعزاز میسّر
بنتا ہے عروسانِ جہاں کے لئے زیور   دستار میں نوشہ کے رہا کرتا ہے اکثر

لیکن نہ کسی وضع پہ اس ڈھنگ سے دیکھا
بیکس کی لحد پر اسے جس رنگ سے دیکھا

دنیا میں جنھیں رتبۂ عالی ہے میسّر   بیکس کی وہ امداد کیا کرتے ہیں اکثر
یاں قوم میں حاصل ہے جنھیں اوجِ فزوں تر   وہ شوخیٔ تقدیر سے دل رکھتے ہیں پتھر

ہمدرد ہوں غیروں کے یہ عادت نہیں ان کی
تکلیف سے ہے جو وہ طبیعت نہیں ان کی

[آزادی و اصلاح]

آزادی و اصلاح کے جب آتے ہیں اذکار   تقلید ہو یورپ کی یہی رہتی ہے گفتار
موجود مگر ان میں وہ جوہر نہیں زنہار   مغرب میں جو تہذیب و ترقی کے ہیں اسرار
وہ حُبِّ وطن خون میں شامل نہیں رکھتے
گو ولولے رکھتے ہیں مگر دل نہیں رکھتے

تھے خطۂ یورپ میں جو اصلاح کے بانی   آزادیِ قومی پہ لہو کر گئے پانی
مرجھا گئے کتنے ہی گلِ باغ جوانی   اس نخل سے پر دور رہا رنگ خزانی
سرگرم شہادت تھے وہ ایثار کی خو سے
سینچا چمنِ قوم رگِ جاں کے لہو سے

تھے یکّہ و تنہا پہ ہزاروں کو نہ سمجھا   عشقِ گلِ مقصود میں خاروں کو نہ سمجھا
سر کٹ گئے تلواروں کی دھاروں کو نہ سمجھا   جل جل گئے شعلوں کو شراروں کو نہ سمجھا
بدکیش ہنود اِن کی مٹا اب نہیں سکتے
وہ آگ لگی ہے کہ بجھا اب نہیں سکتے

بالعکس یہاں قوم کی ہمّت میں ہے پستی   وہ مرد کہاں ہیچ سمجھتے ہیں جو ہستی
یہ جوش فقط جہل و تکبّر کی ہے مستی   اصلاح کے پردے میں ہے بس نفس پرستی

آثار دلوں میں ہیں کہاں دردِ نہاں کے
دکھلاتے ہیں جوہر یہ فقط سیفِ زباں کے

دکھلاتی ہے بس سیفِ زباں جوہرِ عالی
لاریب صدا دیتا ہے جو ظرف ہے خالی
اصلاح کی تقلید ہے اک امرِ خیالی
جب بانیِ اصلاح ہوں خود ضیغمِ قالی

گر حُسن نہیں عشق بھی پیدا نہیں ہوتا
بُلبُل گُلِ تصویر پہ شیدا نہیں ہوتا

شکوہ تو یہ ہے قوم کی برگشتہ ہے تقدیر
چلتی نہیں اصلاح کی اُصلا کوئی تدبیر
لیکن جو ہیں خودداری و خودبینی کے خوگیر
اُن لوگوں کی گفتار میں کس طرح ہو تاثیر

جو خود نہیں سرگرم کرے گا وہ بشر کیا
جب دل میں نہیں درد زباں میں ہو اثر کیا

[مذہب]

سودائے محبت میں انھیں کے نہیں خامی
خود بینی سے خالی نہیں مذہب کے بھی حامی
عرفاں کی خبر لاتی ہو گو طبع گرامی
ہے نفس کی منظور حقیقت میں غلامی

کچھ قوم کی پروا ہے نہ فکرِ کہ و مہ ہے
ہو جائے نجات اپنی تمنا ہے تو یہ ہے

عالم کے دکھانے کے لئے خاک نشیں ہیں　　دعویٰ ہے کہ ہم مالکِ فردوس بریں ہیں
دُنیا کی ترقی پہ صدا چیں بہ جبیں ہیں　　گویا کہ یہی رازِ الٰہی کے امیں ہیں
جو اور ہیں وہ معرفتِ حق سے جُدا ہیں
بس ایک یہی بندۂ مقبولِ خُدا ہیں

انساں کی محبّت کو سمجھتے ہیں یہ آزار　　ہمدردیِ قومی سے انھیں آئے نہ کیوں عار
رہتے ہیں سدا فکر میں عقبیٰ کی گرفتار　　دُنیا کے فرائض سے نہیں ان کو سروکار
یوں جادۂ تسلیم و رضا مل نہیں سکتا
ان میں وہ خودی ہے کہ خُدا مل نہیں سکتا

[پیرانِ نکوکار]

کچھ اور ہی طینت کے ہیں پیرانِ نکوکار　　کرتے ہیں وہ اخلاق سے مذہب کو سُبکبار
کہنے کو تو ہیں دین کے حامی و مددگار　　اور کرتے ہیں تلقین یہ سب کو سرِ بازار
قائم نہ رہو بہرِ خُدا صدق بیاں پر
جو دل میں تمھارے ہے وہ لاؤ نہ زباں پر

منظور انھیں پیروی عہدِ کہن ہے　　مذہب یہی ان کا ہے یہی حُبِّ وطن ہے
کوشش ہے کوئی نیک نہ تدبیر حسن ہے　　ایمان کے پردے میں فقط پاسِ سخن ہے

ان لوگوں کو دُنیا کی ستایش سے غرض ہے
مذہب نہ ہو مذہب کی نمایش سے غرض ہے

لیکن نہیں اخلاص سے کچھ ان کو سروکار — یہ طرزِ عمل قابلِ تحسین نہیں زنہار
باطن میں جس انسان کے اچھے نہیں کردار — ظاہر کی نمایش سے وہ ہوتا نہیں دیندار

دل صورتِ آئینہ جو روشن نہیں ہوتا
زُنّار پہننے سے برہمن نہیں ہوتا

مُردہ ہے رواں روح ہو گر جسمِ بشر سے — کانٹا ہے جُدا ہو جو نزاکت گُلِ تر سے
ہے مثلِ خزف دُور صفا ہو جو گہر سے — آئینۂ بے آب اُترتا ہے نظر سے

مذہب بجز اخلاق رواں ہو نہیں سکتا
معنی سے کبھی لفظ جُدا ہو نہیں سکتا

[تنبیہ]

ہُشیار ہو اے قوم یہ غفلت نہیں اچّھی — یہ خیرگیِ نشۂ دولت نہیں اچھی
معزولیِ آئینِ شرافت نہیں اچّھی — یہ دشمنِ اخلاق شریعت نہیں اچّھی

مانا شبِ ادبار کا ہر سمت اثر ہے
گر خواب سے بیدار ہو اب بھی تو سحر ہے

ہاں ابرِ کرم سے چمن قوم ہو شاداب — واللہ یہی حُسن شرافت کا ہے آداب
حیوان بھی یوں رکھتے ہیں سب شغلِ خور و خواب — تہذیب کا آئین ہے دل سوزیِ احباب

محروم اسی خُلق سے حیوان ہوا ہے
انسان اسی بات سے انسان ہوا ہے

خالق نے دیے ہیں جنھیں اوصاف حمیدہ — ہوش ان کے نہ ہوں نشۂ نخوت سے پریدہ
للہ کریں قوم سے دامن نہ کشیدہ — لائق نہیں پھل پھول کبھی شاخ بریدہ

احباب کی صحبت کو بشر کھو نہیں سکتا
ناخن سے کبھی گوشت جُدا ہو نہیں سکتا

واجب نہیں مذہب کے مسائل میں بھی حجّت — بازیچۂ اطفال ہیں ہفتاد و دو ملّت
بس قابلِ تسلیم اُسی کی ہے شریعت — جس دل میں ہو انساں کے لئے دردِ محبّت

تہذیب پسندیدۂ آفاق یہی ہے
مذہب یہی ملّت یہی اخلاق یہی ہے
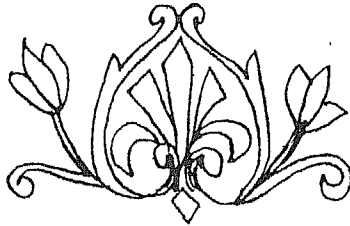
مہادیو گووند رانا ڈے

(نوحہ)

سنہ ۱۹۰۱ء

اے آفتابِ اوجِ امارت کہاں ہے تو اے شمعِ بزمِ حُسنِ لیاقت کہاں ہے تو
اے عندلیبِ باغِ فصاحت کہاں ہے تو اے خضرِ شاہراہِ فراست کہاں ہے تو

"اے رہ نوردِ عالمِ بالا چسگونہٗ
ما بے تو خستہ ایم تو بے ما چگونہٗ"

افسوس آج باغِ جہاں میں نہیں ہے تو پھیلی ہے چار سمت محبّت کی تیری بُو
تو کیا گیا وطن کی گئی تیرے آبرو کیوں چشمِ یاس سے نہ بہے خونِ آرزو

خرمن جلا اُمید کی کھیتی اُجڑ گئی
یہ گلشنِ مُراد پہ کیا اوس پڑ گئی

تیری تو روح گُلشنِ جنّت میں ہے مقیم احباب روتے ہیں تجھے با حالتِ سقیم
دل جانتا ہے اُن کا جو ہے صدمۂ عظیم مرنے سے تیرے قوم مرہٹہ ہوئی یتیم

قائم مکان عزّت و اعزاز کب رہے
تجھ سا ستونِ اعظم شوکت نہ جب رہے

سرچشمۂ کرم تھی تری ذات بے گماں — پاتا تھا فیض تجھ سے ہر اک پیر و نوجواں
ماہی و موج علم تھے تو بحر بے کراں — پُر نور تیرے دم سے تھا یہ تیرہ خاکداں

ممنون تیری ذات کا ہندوستان تھا
اپنے وطن کا فخر مرہٹوں کی جان تھا

میدانِ علم و فن میں عجب یکّہ تاز تھا — بس تجھ سے درِ ترقیِ قومی کا باز تھا
عالم میں سربلند تھا اور سرفراز تھا — اہلِ وطن کو تیری لیاقت پہ ناز تھا

زورِ قلم سے شاہیِ مُلکِ بیاں ملی
بوسے لے جس کے نطق وہ پیاری زباں ملی

تحریر علم و فضل سے تیری تھی انتخاب — اور سادگی و حُسن لطافت میں لاجواب
تقریر میں وہ نورِ معانی کی آب و تاب — ہر دم زباں تھی شہدِ فصاحت سے کامیاب

جب تک نفس کی تن سے روانی نہیں گئی
قبضے سے تیرے سیفِ بیانی نہیں گئی

اِس طرح تیرے فیض سے تھے باریاب ہم — ذرّوں پہ آفتاب کا جس طرح ہو کرم
جُھکتے تھے تیرے سامنے ذیجاہ و ذی حشم — سر کون سا تھا جو ترے آگے نہیں تھا خم

تیری زبان دیتی تھی تازہ بشارتیں
"ہوتی تھیں تیرے نقشِ قدم کی زیارتیں"

اصلاح اور رفاہ میں سرگرم تھا جو تو
تیرے مُرید مُلک میں پھیلے تھے چار سو

دل میں جو تیرے حُبِّ وطن کی تھی آبرو
وابستہ تیری ذات سے تھی سب کی آرزو

اب صاف اختلاف کا دروازہ کُھل گیا
ہر فرد کیوں جُدا نہ ہو شیرازہ کُھل گیا

کشتی ہو جیسے کوئی تلاطم میں مُبتلا
اور جوش میں ہوں موجہ و گرداب جابجا

ہو ابر و باد و برق سے طوفان اک بپا
تاریک شب کی سر پہ ہو چھائی ہوئی بلا

برپا ہو شور رعد موافق ہَوا نہ ہو
اور ساحل مُراد کا کوسوں پتا نہ ہو

لیکن ہو ناخُدا کوئی اس درجہ ہوشیار
منجھدھار سے جو بچ کے ہو جاتا سوے کنار

کشتی کو اُن ہَوا کے تھپیڑوں سے لے اُبھار
ٹکرا کے ٹکڑے ٹکڑے ہوں جن سے حباب وار

دھڑکا ذرا نہ اس کے دلِ پُر ہمم کو ہو
آئے شکن جبیں پہ نہ لغزش قدم کو ہو

اِتنے میں رنگ اور ہی قہرِ خدا کرے
بجلی فلک سے گر کے قیامت بپا کرے

اُس ناخُدا کی روح کو تن سے جُدا کرے
منجھدھار میں پڑی ہوئی کشتی بہا کرے

گرداب میں پھنسے کبھی موجوں میں جا پڑے
کیا جانے اس پہ بحر میں اُفتاد کیا پڑے

تیرے فراق میں ہے یہی حال قوم کا — تو ناخدائے کشتیِ اصلاح حال تھا

طوفاں جو بغض و جہل و تعصب کا بپا — تھی ان خرابیوں میں تری ذات رہنما

تجھ کو تو موت لے گئی باغِ نعیم میں

چھوڑا ہمیں دو آبہ اُمّید و بیم میں

یا یہ کہ راہِ راست سے گمراہ کارواں — شب کو لُٹا پٹا کسی جنگل میں ہو رواں

کچھ فاصلے پہ دشت سے اک نور ہو عیاں — سمجھے وہ اس کو منزلِ مقصود کا نشاں

دل خوش یہ جان کر ہو کہ جانا کدھر کو ہے

روشن وہیں چراغ ہے بستی جدھر کو ہے

اتنے میں گر ہوا سے وہ بجھ جائے ناگہاں — حالت وہ اہل قافلہ کی ہو کہ الاماں

نظروں سے ہو گیا ہے ہماری جو تو نہاں — احباب کا ترے وہی عالم ہے بیگماں

تو رہنمائے قوم تھا روشن دماغ تھا

اور اپنے بزمِ مُلک کا چشم و چراغ تھا

بزمِ وطن میں یوں تو بہت گُل ہوئے چراغ — ویران سیکڑوں گُلِ تر کر گئے یہ باغ

لیکن یہ ہے محال کہ در صورتِ فراغ — دل سے مٹے یہ مادرِ ہندوستاں کے داغ

بہتر بھی ہے یہی کہ یہ ماتم بپا رہے

تا حشر دل میں زخمِ محبّت ہرا رہے

کُتبے ہوں سنگ و خشت کے کتنے ہی استوار　　ان کو مٹا ہی دیتا ہے نیرنگ روزگار

لیکن جو تیرے مُلک پہ احساں ہیں بے شمار　　سب تیرے جوشِ حُبِّ وطن کے ہیں یادگار

تیری زبانِ حال سے مدحت کہیں گے یہ

تہذیب کا وجود ہے جب تک رہیں گے یہ

گلزار قوم میں اگر آئے کبھی بہار　　تو تازہ ہو گی روح تری بھی نسیم وار

پودے ترے لگائے ہوئے ہیں جو بے شمار　　تازہ کرینگے ذکر ترا ان کے برگ و بار

خنداں گلِ مُراد اگر ان میں ہوئیں گے

شبنم کی طرح یاد میں ہم تیری روئیں گے

ایک جوان مرگ دوست

(نوحہ)

۱۹۰۴ء

اے فدائے یاس و حرماں اے شہید آرزو　　خاک کے دامن میں کیسا بیخبر سویا ہے تُو

چشم دل کو باعثِ حیرت ہے تیری جُستجو　　پھول تھا پر ہاتھ سے جاتا رہا مانندِ بُو

لالہ و گُل سے طبیعت تُو نے بہلائی نہیں

کیا ہوا باغِ جہاں کی تجھ کو راس آئی نہیں

؎ پنڈت پرتاب کشن گرٹو۔

قلزمِ عالم کی تو نے سیر کی مثلِ حباب　　خواب کا نیرنگ تھا یا تھا ترا حسنِ شباب
برق کا جلوہ تھا یا قوسِ قزح کی آب و تاب　　یا شرر یا قطرۂ شبنم میں عکسِ آفتاب

خانۂ تن تھا ترا سیلِ فنا کے سامنے
شمع تیری زندگی کی تھی ہوا کے سامنے

ایک دم میں لٹ گئی تیری جوانی کی بہار　　آہ ایسے بھی زمانہ سے گئے کم سوگوار
نامرادیں اور تمنائیں ہیں تجھ سے شرمسار　　دل ہے پہلو میں ترے یا آرزوں کا مزار

کون کہتا ہے کہ ہے زیرِ کفن میت تری
خاک و خوں میں منہ لپیٹے ہے پڑی حسرت تری

پاؤں پھیلا کر جو یوں سویا ہوا ہے بے خبر　　کیا ہے خوابِ مرگ میں خوابِ جوانی کا اثر
دیکھ آنکھیں کھول کر عالم ہے کیا پیشِ نظر　　آئی ہے فردوس سے سر پیٹتی روحِ پدر

سرو قد اٹھا نہیں جاتا اگر تعظیم کو
ہاتھ ہی اپنا ہلا دے آخری تسلیم کو

کچھ خبر ہے تجھ کو اے دل دادۂ خوابِ فنا　　ہے سرِ بالیں یہ کیا ہنگامۂ محشر بپا
نعرہ ہائے درد یہ کیسے ہیں یہ ماتم ہے کیا　　چاک ہے کس کا گریباں کون ہے سر دھن رہا

ہے تڑپتا کون دل تھامے سے کس کا سیر ہے
بال کس نے لاش پر کھولے یہ کیا اندھیر ہے

دیکھ تیری بیوۂ غمگیں پہ کیا افتاد ہے — محوِ حیرت یاس سے وہ کشتۂ بیداد ہے
مُہرِ خاموشی لبوں پر دل میں تیری یاد ہے — خانۂ ویراں کی صورت خاطرِ ناشاد ہے

خاک آلودہ مسرّت ہائے پنہاں ہوگئیں
آرزوئیں دل کی سب خوابِ پریشاں ہوگئیں

دردِ دل اُس کا لبِ خاموش کہہ سکتا نہیں — اشکِ حسرت دیدۂ پُرنم سے بہہ سکتا نہیں
بند سینے میں مگر طوفاں یہ رہ سکتا نہیں — یہ وہ صدمہ ہے کہ دل انساں کا سہہ سکتا نہیں

محوِ حیرت ہم نشیں ہیں اس کی آہِ سرد سے
سوزشِ پنہاں عیاں ہے اس کے رنگِ زرد سے

خواب میں سُنتا ہو جیسے نغمۂ شیریں بشر — جس سے طاری دل پہ ہو کیفیتِ جادو اثر
یہ نوائے روح پرور بند ہو جائے اگر — آنکھ کُھلتے ہی سیاہی شب کی ہو پیشِ نظر

اک عجب عالم ہو تب اس کے دلِ بیتاب کا
جاگنے پر اُس گھڑی اُلٹا گُماں ہو خواب کا

بس یہی عالم ہے تیری بیوۂ ناشاد کا — نغمہ ہائے عیش سے تھے کان اس کے آشنا
ہو گیا ہے اب جو تیرا سازِ ہستی بے صدا — کس تحیّر کس پریشانی میں ہے وہ بے نوا

کیا کہے دردِ جگر مُنہ سے کہا جاتا نہیں
تیرے مرنے کا اُسے اب تک یقیں آتا نہیں

مادرِ ناشاد تیری وہ ازل کی سوگ وار　　پہلے ہی اس کی نگاہوں میں تھی دُنیا تنگ و تار
تیرے دم سے تھا بندھا شیرازۂ صبر و قرار　　ہائے اس بیکس کا اب بیڑا کرے گا کون پار

آج اس کا مایۂ تاب و تواں جاتا رہا
ناخدائے کشتیِ بے بادباں جاتا رہا

وہ اسیرِ بے خودی تیری یتیمِ خرد سال　　پھول سے چہرہ پہ اُس کے ہے جمی گردِ ملال
کچھ طلسمِ آفرینش کا نہیں کھلتا مآل　　پیرِ گردوں کے ستم سے مجھ کو حیرت ہے کمال

ہائے معصوموں پہ بھی ظالم ترس کھاتا نہیں
یہ رُلاتا ہے اُنھیں رونا جنھیں آتا نہیں

کیا وہ ناداں ہیں جو کہتے ہیں نرودے اعتبار　　مصلحت رہتی ہے رنج و درد میں بھی آشکار
ہے فسانہ یہ حدیثِ صبر و تسکین و قرار　　خوابِ ہستی کی نہیں تعبیر ایسی زینہار

میں نظامِ دھر میں کچھ مصلحت پاتا نہیں
اس سمندر کا مجھے ساحل نظر آتا نہیں

خاک میں تجھ کو ملانا تھا اگر با اشک و آہ　　کس لیے تجھ پر ہوئی وا منزلِ ہستی کی راہ
ساتھ تیرے کیوں ملے مٹی میں اتنے بے گناہ　　زندگی جن کی ہے اب وابستۂ حالِ تباہ

لب فغاں کو چشم ہے آنسو بہانے کے لئے
دل ہے جلنے کو جگر ہے داغ کھانے کے لئے

وائے بر قسمت یہ کیا نیرنگِ دوراں ہوگیا	تو عدم آباد پہونچا گھر بیاباں ہوگیا
ہائے کیا دل تھا کہ وقفِ یاس و حرماں ہوگیا	یا تمناؤں پہ اپنی آپ قرباں ہوگیا

نو بہارِ زندگی میں تو رہا ناکامِ عیش
لب تلک آنے نہ پایا تھا کہ چھلکا جامِ عیش

عیش و عشرت کے ہزاروں جس نے ساماں ہوں کئے	وہ مئے راحت کے بدلے خونِ دل اپنا پیے
کیسے کیسے رنج تجھ کو نامرادی نے دیئے	ہائے تو دنیا میں آیا تھا اسی دن کے لئے

داغِ حسرت یادگار اپنا ہمیں دے کر گیا
خود زمانے سے دلِ پُر آرزو لے کر گیا

پھر رہی ہے دیدۂ مشتاق ہیں صورت تری	کھیلتی رہتی تھی ہر دم تیرے ہونٹوں پر ہنسی
ہے ہمارے پردہ ہائے گوش میں اب تک بسی	گفتگو تیری جوانی کی امنگوں سے بھری

اب وہ لطفِ زندگی حاصل نہ ہوگا خواب میں
جانشیں تیرا کہاں ہے صحبتِ احباب میں

اب وہ ربط و ضبط وہ اگلی ملاقاتیں کہاں	وہ بگڑنا اب کہاں وہ میل کی باتیں کہاں
دل لگی کی ہر گھڑی ہر دم نئی گھاتیں کہاں	وہ زمانہ اب کہاں وہ دن کہاں راتیں کہاں

بے مزہ تیری مئے لطفِ جوانی ہوگئی
داستانِ عیش اپنی بھی کہانی ہوگئی

ساتھ کس کے ہوگی اب وقتِ سحر سیرِ چمن　　گرم کس کی گفتگو سے ہوگی شب کی انجمن
خندہ پیشانی سے دے گا کون اب دادِ سخن　　کون ہوگا موت پر مجھ خستہ جاں کی نوحہ زن

تو مرا ہمدرد سچّا آشنا جاتا رہا
زندگی کا لطف مرنے کا مزا جاتا رہا

چشم ظاہر بیں کو اب دیدار تیرا ہے محال　　ہے مگر آراستہ تجھ سے مری بزمِ خیال
یہ وہ عالم ہے جسے مانا ہے سب نے لازوال　　ہو مُخل یاں اپنی صحبت میں فلک کی کیا مجال

ہاں فنا کر دوں گا میں نیرنگیِ تقدیر کو
آئینہ میں دل کے رکھوں گا تری تصویر کو

صحبتِ احباب میں ہیں گر یہی رنج والم　　کاشکے پیدا ہوئے ہوتے کسی صحرا میں ہم
زندگی کا عیش ہوتا اور نہ مرنے کا ستم　　ہاں اگر ہوتا تو ہوتا ایک تنہائی کا غم

نوحہ خواں ہوتا نہ کوئی چرخ گرداں کے تلے
قبر بن جاتی کہیں ریگِ بیاباں کے تلے

ہے مگر یہ دارِ فانی وہ طلسمِ دل نشیں　　یاد کم رکھتی ہے اس کی زحمتیں طبعِ حزیں
یہ وہ عقدہ ہے جو فکر و غور سے کھلتا نہیں　　جہل سے بد تر نظر آتی ہے عقلِ دوربیں

ہائے اس دُنیا کی پابندی عجب مُشکل گیر ہے
خود پہنتا ہے جسے انساں یہ وہ زنجیر ہے

جلوۂ صبح

۱۸۹۸ء

جب زنگِ شب آئینۂ ہستی سے ہُوا دُور
ہنگامِ سحر کون و مکاں ہو گئے پُر نُور
تبدیل ہوئی صورتِ کوہِ شبِ دیجور
چمکا وہ تجلّیِ سحر سے صفتِ طور

بجلی کی طرح چرخ پہ نُورِ سحر آیا
آنکھوں کو نہ پھر خرمنِ انجم نظر آیا

تھی نُور میں تفریح تو نور ارض و سما میں
سرگرمی بشر میں تھی بشر یادِ خدا میں
تھی تازگی خُنکی میں تو خُنکی تھی ہوا میں
شادابی تھی نگہت میں تو نگہت تھی صبا میں

خورشید منور کا دمِ جلوہ گری تھا
نُورِ رُخِ مہتاب چراغِ سحری تھا

دریائے فلک میں تھا عجب نور کا عالم
چکر میں تھا گردابِ صفت نیّرِ اعظم
اُٹھتی تھیں شعاعوں کی جو موجیں وہ شررِ دم
سیارے حبابوں کی طرح مٹتے تھے پیہم

تھی شورشِ طوفانِ سحر غرب سے تا شرق
آخر کو سفینہ مہِ گردوں کا ہوا غرق

والشمس تھا کندہ شہ خاور کے نگیں پر
واللیل کا باقی تھا نشاں بھی نہ کہیں پر
تھی مہر کی پھیلی جو ضیا چرخ بریں پر
آنے لگا رہ رہ کے وہی نور زمیں پر
ذرّوں کا ستارہ بھی چمکتا نظر آیا
پیمانہ خورشید چھلکتا نظر آیا

وہ صبح کا عالم وہ چمن زار کا عالم
مُرغانِ ہوا نغمہ زنی کرتے تھے باہم
ہنگام سحر بادِ سحر چلتی تھی پیہم
آرام میں سبزہ تھا تہِ چادرِ شبنم
ہر سمت بندھی نعرۂ بُلبُل کی ہوا تھی
غنچوں کی نسیمِ سحری عقدہ کشا تھی

جو نخل تھا گلشن میں برومند کھڑا تھا
دامانِ سحر میں گُلِ خورشید پڑا تھا
کیا خوب مقدّر چمنستاں کا لڑا تھا
ہر گُل پہ گُہر قطرۂ شبنم کا جڑا تھا
بُلبُل کہیں طاؤس کہیں گھوم رہے تھے
مستوں کی طرح نخل چمن جھوم رہے تھے

مُرغانِ چمن عالمِ مستی میں سحر دم
وصفِ چمن آرائے جہاں کرتے تھے باہم
شاخیں تھیں کہیں گردنِ تسلیم صفت خم
تسبیح خُدا میں ہمہ تن محو تھی شبنم
غنچوں کے بھی تھی وردِ زباں حمد خُدا کی
آتی تھی چٹکنے میں صدا صلِّ علٰی کی

تھا پیشِ نظر وادیِ ایمن کا تماشا — ہر شاخ و شجر میں شجرِ طور کا نقشا

تھا آتشِ گُل میں اثرِ برقِ تجلّےٰ — مدہوش تھے مُرغان ہوا صورتِ موسیٰ

شکلِ یدِ بیضا تھی ہر اِک شاخ نظر میں

اعجاز کا گُل تھا کفِ گلچینِ سحر میں

رونق پہ دمِ صبح تھا خمخانۂ عالم — تھم تھم کے ہوا چلتی تھی سرسری بھی تھی کم کم

پیمانۂ مہتاب تھا لبریز سحر دم — تھا جامِ صبوحی کے لئے نیّرِ اعظم

گردوں پہ شفق کی بھی عجب جلوہ گری تھی

مینائے فلک میں مئے گلرنگ بھری تھی
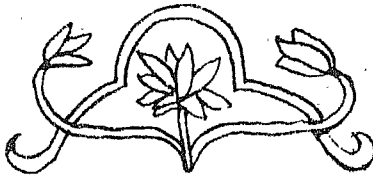
آبِ انگور

۱۸۹۹ء

محیطِ دہر میں تہذیب کا جو دَور ہوا　　ہوا بدل گئی رنگِ زمانہ اور ہوا
دماغ کے لئے سامانِ فکر و غور ہوا　　خُدا کی شان جہاں کا عجیب طور ہوا
گھٹا جو جہل تو سامانِ عزّ و جاہ بڑھے
شعور کو جو ترقّی ہوئی گُناہ بڑھے

جو غور و فکر ہوئے زینتِ جنوں آباد　　سجائے عقل نے آسائشوں کے باغِ مراد
پڑی ترقّیِ علمی سے عیش کی بنیاد　　برائے نشہ ہوئی حکمتِ کشید ایجاد
جہاں میں آبِ طرب کا ظہور اس سے ہوا
خیالِ پاسِ ادب دل سے دُور اس سے ہوا

ہوئی جو بادہ کشی باغ دہر میں منظور　　دلِ بشر سے ہوئی یک قلم مروّت دور
برنگِ شیشہ جو نازک تھا دانۂ انگور　　کیا اک آن میں سنگِ جفا سے توڑ کے چور
دلِ عروس گلستاں کو دردناک کیا
بھری بہار میں ظالم نے خونِ تاک کیا

کھنچی شراب تو کی بادہ کش نے یوں تعریف　　بجا ہے کیجیے آپِ طرب کی جو توصیف
مزا شباب کا آئے پیے جو اس کو ضعیف　　دماغ ہو تر و تازہ وہ پاک و صاف و لطیف

کہا ہے پھول تو پوچھا اس میں گفتگو بھی ہے
گلوں کا رنگ بھی ہے اور گلوں کی بو بھی ہے

نہ تھا یہ ہوش کہ اس پھول میں ہے رنگِ خزاں　　تباہ ہوتی ہے اس سے بہارِ عمرِ رواں
وہ بو ہے اس کی دماغِ بشر ہو جس سے گراں　　ہے اس کے رنگ سے خونِ جگر کا رنگ عیاں

ہے خوشگوار پہ سوہانِ روح و جسم ہے یہ
ہوئے اسیر ہزاروں عجب طلسم ہے یہ

رفیق اس کی ہے مستی عدو شعور اس کا　　وداعِ ہوش کا ساماں ہے ظہور اس کا
خمارِ مرگ جو لائے وہ ہے سرور اس کا　　سیاہ قلب کو کر دے جو ہے وہ نور اس کا

لگائے آگ کلیجے میں جو وہ آب ہے یہ
کرے جو طرفہ قیامت وہ آفتاب ہے یہ

خیالِ بادہ کشی دل میں گر ہویدا ہو　　تمام قلب سیہ صورتِ سویدا ہو
زباں مزے پہ جو آبِ طرب کی شیدا ہو　　تو سوزِ آتشِ پنہاں جگر میں پیدا ہو

زباں کے واسطے گو رشکِ انگبیں ہے یہ
مگر جگر کے لئے آبِ آتشیں ہے یہ

عدو بشر کی یہ ہے اس پہ ہے خدا کا عتاب   کسی کے دل میں کرے گھر نہ لبس یہ خانہ خراب
نہ اس کے شوق میں برباد ہو کسی کا شباب   کسی کے دل میں الٰہی نہ ہو ہوائے شراب

تباہ سیکڑوں روشن دماغ اس نے کئے
بجھا کے داغ ہزاروں چراغ اس نے کئے

ہزاروں پردۂ عصمت کو چاک چاک کیا   ہزاروں حسن کا اک اک جواں ہلاک کیا
جگر کو خون کیا آرزو کو خاک کیا   چمن جو تھے انھیں صحرائے دردناک کیا

نشاں مٹائے امنگوں کے اور ارادوں کے
لہو میں غرق سفینے کئے مرادوں کے

کیا لحاظ نہ شاہوں کا نے وزیروں کا   بنایا دست نگر ہاتھ دستگیروں کا
کیا فقیر سے کم مرتبہ امیروں کا   ریاض خاک میں سب مل گیا فقیروں کا

ہر اک کے خاطر بیکس کی آرزو کھوئی
جواں کا حسن تو پیروں کی آبرو کھوئی

بس اس کی ہجو کا یارا نہیں سخن کے لئے   جگر کو نیش ہے یہ نوش ہے دہن کے لئے
مضر ہے اس کی ہوس حفظِ جان و تن کے لئے   خزاں ہے اس کی ہوا دین کے چمن کے لئے

چمن وہ کون کہ گر اک کلی بھی جھڑ جائے
بہارِ گلشن ایماں پہ اوس پڑ جائے

ہزار حیف کہ ہو دورِ بادۂ تہذیب / بشر کے واسطے دُنیا میں باعثِ تخریب

نہ تھا زمانۂ وحشت میں گو یہ عیش نصیب / ولیک پاک گناہوں سے تھا یہ عہدِ غریب

نہ تھا شعور تو دُنیا بھی یوں خراب نہ تھی

تمیزِ نشہ کی جب تک نہ تھی شراب نہ تھی

برسات

سنہ ۱۹۰۰ء

ہے دلاتی یادِ مے نوشی فضا برسات کی / دل بڑھا جاتی ہے آ آ کر گھٹا برسات کی

بندھ گئی ہے رحمتِ حق سے ہوا برسات کی / نام کھلنے کا نہیں لیتی گھٹا برسات کی

اُگ رہا ہے ہر طرف سبزہ در و دیوار پر / انتہا گرمی کی ہے اور ابتدا برسات کی

دیکھنا سوکھی ہوئی شاخوں میں بھی جان آ گئی / حق میں پودوں کے مسیحا ہے ہوا برسات کی

ہوں شریکِ بزمِ مے زاہد بھی توبہ توڑ کر / جھومتی قبلے سے اُٹھی ہے گھٹا برسات کی

اصل تو یوں ہے مے و معشوق کا جب لطف ہے / چاندنی ہو رات کو دن کو گھٹا برسات کی

وہ پپیہوں کی صدائیں اور وہ موروں کا رقص / وہ ہوائے سرد وہ کالی گھٹا برسات کی

پار اُتر جائیں گے بحرِ غم سے رندِ بادہ نوش / لے اُڑے گی کشتیِ مے کو ہوا برسات کی

خود بخود تازہ اُمنگیں جوش پر آنے لگیں / دل کو گرمانے لگی ٹھنڈی ہوا برسات کی

وہ دعائیں مے کشوں کی اور وہ لطفِ انتظار ہائے کن نازوں سے چلتی ہے ہوا برسات کی

میں یہ سمجھا ابر کے رنگین ٹکڑے دیکھ کر تخت پریوں کے اڑا لائی ہوا برسات کی

ناز ہو جس کو بہارِ مصر و شام و روم پر

سر زمینِ ہند میں دیکھے فضا برسات کی

*

جلسۂ کانفرنس[1]

(ماخوذ از کشمیر درپن۔ ستمبر ۱۹۰۳ء)

ہر اک کو آج جوش محبت دوچند ہے آوازۂ حمیت و غیرت بلند ہے

غل ہے کہ راہِ نحس تنزل کی بند ہے مردوں کو شاہراہ ترقی پسند ہے

اُمید ہائے نو کا دلوں میں ہجوم ہے

ہاں انعقاد جلسۂ قومی کی دھوم ہے

ہاں کیوں نہ ہو کہ مایۂ فخرِ وطن ہے یہ گل جس میں اتحاد کے ہیں وہ چمن ہے یہ

ہے روح جس کی جوہرِ ایماں وہ تن ہے یہ شمع شعور جس میں ہے وہ انجمن ہے یہ

اس کا وجود باعثِ اعزاز قوم ہے

یہ بزم پاک انجمنِ ناز قوم ہے

---

[1] یہ نظم کشمیری پنڈت سوشل کانفرنس کے جلسہ میں پڑھی گئی تھی۔

یارب یہ بزم رنگ میں اپنے ہو یادگار — ایسی ہوا چلے کہ دلوں کا اُڑے غبار

اکجا ہوں جمع قوم کے ارباب نامدار — ذی علم و ذی لیاقت و ذی ہوش ذی وقار

نیرنگیِ نصیب کی پھر داستاں کھُلے

اظہار مدعاے دلی کی زباں کھُلے

عبرت فزا ہو یاس کا افسانۂ کہن — قلب و جگر میں آتشِ پنہاں ہو شعلہ زن

ہے بیکسی سے قوم جو اِک نقش بےکفن — عیسیٰ ہوں اس کے حق میں اراکین انجمن

دے جوشِ حُبِّ قوم دلوں کو سبق نیا

ہر دفترِ حیات میں اُلٹے ورق نیا

ہو دل سے دُور گردشِ تقدیر کا ہراس — مردانہ وار غیرت و ہمت کا آئے پاس

باطل پسند جو ہیں نظر آئیں حق شناس — افسوں سے اتحاد کے ٹوٹے طلسم یاس

در بند ہو نفاق کا اُلفت کی رہ کھُلے

اعجاز حُبِّ قوم نے دل کی گرہ کھُلے

ابرِ کرم کا اشک ندامت کریں اثر — ہوں باغ قوم میں شجر خشک بارور

مردہ دلوں میں سوز محبت کرے گذر — اُڑتے ہوے دکھائی دیں اس راکھ سے شرر

بازار سرد مہریِ احباب سرد ہو

پیدا ہر ایک دل میں محبت کا درد ہو

قائم کرے وہ رشتۂ الفت یہ انجمن
مضبوط پھر ہو قوم کا شیرازۂ کہن

ہر اک زباں پہ جوشِ محبت کے ہوں سخن
سب کی رگوں میں خون حمیّت ہو موجزن

طبقہ اُلٹ دیں بختِ نحوست شعار کا
نقشہ بدل دیں گردشِ لیل و نہار کا

کلام متفرق

مری بیخودی ہے وہ بیخودی کہ خودی کا وہم و گماں نہیں
یہ سُرورِ ساغرِ مے نہیں یہ خمارِ خوابِ گراں نہیں

جو ظہورِ عالمِ ذات ہے یہ فقط ہجومِ صفات ہے
ہے جہاں کا اور وجود کیا جو طلسمِ وہم و گماں نہیں

یہ حیاتِ عالمِ خواب ہے نہ عذاب ہے نہ ثواب ہے
وہی کفر و دیں میں خراب ہے جسے علمِ رازِ جہاں نہیں

وہ ہے سب جگہ جو کرو نظر وہ کہیں نہیں جو ہو بے بصر
مجھے آج تک نہ ہوئی خبر وہ کہاں ہے اور کہاں نہیں

نہ وہ خُم میں بادہ کا جوش ہے نہ وہ حُسن جلوہ فروش ہے
نہ کسی کو رات کا ہوش ہے وہ سحر کو شب کا سماں نہیں

یہ زمیں پہ جن کا تھا دبدبہ کہ بلند عرش پہ نام تھا
اُنھیں یوں فلک نے مٹا دیا کہ مزار کا بھی نشاں نہیں

یوں نہ انسان کا برگشتہ مقدر ہو جائے
میں اگر پھول اُٹھاؤں تو وہ پتھر ہو جائے

مغرب کے بوستاں میں جو رنگِ خزاں نہیں
سُنتے ہیں اُس زمین پہ یہ آسماں نہیں

کچھ اور ہے وہ شاعرِ معجز بیاں نہیں
جس کے سخن سے رنگ طبیعت عیاں نہیں

بلبل کی طرح شور مچاتے ہیں رات دن
جو آشنائے لذتِ دردِ نہاں نہیں

مضمون آبدار ہیں دُرہائے شاہوار
دریائے نور ہے مری طبعِ رواں نہیں

اظہارِ درد غیر سے کرتے ہیں بوالہوس
ہم کو دماغ نالہ و آہ و فغاں نہیں

اُس مُردہ دل کو خاک نہیں زندگی کا لُطف
جس کی شباب میں بھی طبیعت جواں نہیں

دوشِ صبا پہ رہتا ہوں مانندِ مُرغِ بُو
شاخِ شجر کو بارِ مرا آشیاں نہیں

جادو کسی کے حُسن کا چلتا ہے رات دن
بیکار نقش بندیِ کون و مکاں نہیں

کیا دیکھتے ہی دیکھتے دُنیا بدل گئی
واللہ وہ زمیں نہیں وہ آسماں نہیں

جہاں میں یوں ہوں زباں جس طرح دہن کے لئے — سخن ہے میرے لئے اور میں سخن کے لئے

بشر کا دل وہ نہیں سنگ و خشت ہے لاریب — کہ جس میں دردِ محبت نہ ہو وطن کے لئے

خراب غفلتِ احباب سے ہوئی مٹی — ہماری لاش پڑی رہ گئی کفن کے لئے

ابھی نیا جوش عشق کا ہے صلاح سنتے نہیں کسی کی
کریں گے آخر میں پھر وہی ہم جو چار یار آشنا کہیں گے
ہمارے اور زاہدوں کے مذہب میں فرق اگر ہے تو اس قدر ہے
کہیں گے ہم جس کو پاسِ انساں وہ اُس کو خوفِ خدا کہیں گے

اہلِ بینش کو تو ہستی میں خدا کی شک ہے — اُن پہ حسرت ہے جو بندے کو خدا کہتے ہیں

نامِ مردوں کا ازل سے ہے ابد تک زندہ — لوگ دنیا کو عبث دارِ فنا کہتے ہیں

گُل نہیں تو بوئے گل ہی سے معطر ہو دماغ — کوئی رکھ دیتا قفس میرا ہوا کے سامنے

رنج و راحت کا سبب دنیا میں کچھ پایا نہیں — حشر میں ہم صاف کہہ دیں گے خدا کے سامنے

ہر دم ہے طبیعت کو اُلجھن اِک یاس کا عالم طاری ہے

یہ سانس نہیں اِک کانٹا ہے یہ زیست نہیں بیماری ہے

بڑھاپا نام ہے جس کا وہ ہے افسردگیٔ دل کی — جوانی کہتے ہیں جس کو طبیعت کی جوانی ہے

جگہ تھوڑی سی مِل جائے اگر گورِ غریباں میں — دلِ ناشاد کی چھوٹی سی اِک تربت بنانی ہے

فصلِ گُل میں عشقِ گُل فصلِ خزاں میں یادِ گُل — مَیں اسیرِ اُلفتِ نیرنگِ گلشن ہو گیا

چمن کو دیدۂ عبرت سے دیکھ اے بُلبُل — گلوں سے پھوٹ کے رنگِ خزاں نکل آیا

ازل کے دن جو تباہی کی فال دیکھی گئی — تو نامِ کشورِ ہندوستاں نکل آیا

روح کو اپنی ہے عشقِ جوہرِ حسنِ لطیف — گُل سے بڑھ کر ہے خیالِ رنگ و بو میرے لئے

خانہ ویرانی مری سب چاہتے ہیں شکلِ در — اِک بلائے جاں ہے میری آبرو میرے لئے

قطرۂ شبنم جسے طوفاں ہے وہ بُلبُل ہوں مَیں — بُوئے گُل ہے باعثِ دردِ گلو میرے لئے

رُوح و قالب کی طرح روزِ ازل پیدا ہوا — لکھنؤ کے واسطے مَیں لکھنؤ میرے لئے

شیخ کو شوقِ شباب دیکھئے کب تک ہے — ریش پہ رنگِ خضاب دیکھئے کب تک ہے

دکھاتا عشق کامل کچھ اثر گر بعد مُردن بھی — تو ہوتا مرقدِ لیلےٰ پہ سایہ بید مجنوں کا

جو نکتہ سنج تھے اُن کا نشاں نہیں ملتا — سُنائیں کس کو سخن قدرداں نہیں ملتا

مٹایا گردشِ دوراں نے اِس طرح مجھ کو — کہ بیکسی کو بھی میرا نشاں نہیں ملتا

کہاں احاطۂ ہستی سے بھاگ کر جاؤں — نئی زمین نیا آسماں نہیں ملتا

ہوئے قفس سے رہا بھی تو کس مصیبت میں — اندھیری رات ہے اور آشیاں نہیں ملتا

ناشاد رہے ناکام رہے تقدیر ہی اپنی پھوٹ گئی

جس شاخ پہ ہم نے ہاتھ دھرا وہ شاخ وہیں سے ٹوٹ گئی

اب چین کہاں آرام کہاں اُمید کہاں ارمان کہاں

آئی تھی الم کی فوج گراں وہ دل کی بستی لوٹ گئی

بے رنگ آنکھ کو محسوس اور دماغ کو بُو — وہ شے جو اصل میں گُل ہے کہیں چمن میں نہیں

رباعیات

بوگُل کے لئے ہے گُل ہے شبنم کے لئے
اِک ربط ہے انتظام عالم کے لئے
لیکن ہے مرا شباب ماتم کے لئے
غم میرے لئے ہے اور میں غم کے لئے

بیکار تعلّی سے ہے نفرت مجھ کو
لوں دادِ سخن نہیں یہ عادت مجھ کو
کس واسطے جُستجو کروں شہرت کی
اِک دن خود ڈھونڈھ لیگی شہرت مجھ کو

آباد ہے اصل میں نہ ویرانہ ہے
شادی کا یہ گھر ہے نہ عزاخانہ ہے
واللہ نہ مبتدا ہے اس کی نہ خبر
دُنیا اِک ناتمام افسانہ ہے

طفلی کا جمال ہے قمر کی صورت
ٹھنڈک پیری میں ہے سحر کی صورت
لیکن وہ قیامت کا سماں ہے جس دم
ڈھلتا ہے شباب دوپہر کی صورت

لارڈ کرزن سے جھپٹ[عـ۵]

(نظم ظریفانہ)

وہ شبِ تار میں تاروں کا فلک پر جمگھٹ   چھپ گیا آنکھ سے بدلی جو زمیں نے کروٹ

دیکھنا شرق میں وہ صبح کا تارا چمکا   وہ عروسِ سحر نور نے اُلٹا گھونگھٹ

بڑھ کے رضواں نے وہ جنت کے دریچے کھولے   آئی وہ گلشنِ فردوس سے پھولوں کی لپٹ

چونک اُٹھا پیرِ فلک بانگ لگائی ایسی   مُرغ نے گریۂ مسکیں کی جو پائی آہٹ

گُدگُدایا جو نسیمِ سحری نے آکر   ناز سے سبزۂ خوابیدہ نے بدلی کروٹ

نظر آتا ہے گلستاں میں پرستاں کا سماں   گُل کھِلے ہیں کہ ہے پریوں کا چمن میں جمگھٹ

یہ بہارِ چمنستاں یہ سحر کا عالم   ہاں ذرا بادۂ گلرنگ تو لانا جھٹ پٹ

ہاں وہ مے ہو کہ جو مل جائے کہیں تھوڑی سی   شیرِ مادر کی طرح شیخ بھی پی لے غٹ غٹ

دیکھنا لے کے صراحی مِرا ساقی آیا   جام میں بادۂ گلرنگ دیا اُس نے اُلٹ

اب میں پیتا ہوں لبوں تک مرا ساغر پہونچا   ختم مے ہو گئی لو حلق سے اُتری تلچھٹ

عـ۵ یہ ظریفانہ نظم منشی سجاد حسین مرحوم اڈیٹر اودھ پنچ کے حسب فرمائش تصنیف کی گئی تھی اور اودھ پنچ میں شائع بھی ہوئی تھی۔ لارڈ کرزن نے کلکتہ یونیورسٹی کے کانووکیشن کے موقع پر ایک تقریر فرمائی تھی جس میں ہندوستانیوں کی تہذیب و اخلاق پر سخت اور ناجائز حملہ کیا تھا۔ اُسی کا ذکر اس نظم میں ہے۔

آ گیا جوش طبیعت میں بڑھی گردشِ خون
ڈورے آنکھوں کے ہوئے لال پھری گرباہٹ

نشہ میں چور ہوں اور سوجھتی ہے دور کی اب
ڈر ہے کرزن سے نہ ہو جائے کہیں مجھ سے جھپٹ

لیجئے سامنے میرے ہے شبیہِ کرزن
رنگ اس طرح بدلتی ہے کہ جیسے گرگٹ

سُرخ غصّہ سے کبھی زرد کبھی صدمہ سے
خوف کے مارے کبھی رنگ میں ہے نیلاہٹ

آئے ہیں آپ تو کچھ حضرتِ کرزن سُنئے
آپ اگر منہ کے کڑے ہیں تو ہوں میں بھی منہ پھٹ

آ گیا طیش مجھے دل کا نکالوں گا بُخار
صاف کہتا ہوں نہیں بات میں اپنی ہنوٹ

مانیئے گا نہ بُرا آدمی ہیں آپ شریف
عالم نشہ میں بک جاؤں اگر کچھ سٹ پٹ

ہاں یہ کیوں آپ کے گُم ہوگئے ہیں ہوش و حواس
کنووکیشن میں یہ دکھلائی ہے کیا جھلّاہٹ

گُل فشانی کے عوض دُور کیا دل کا بُخار
خوب پھینکا سرِ احباب پہ کوڑا کرکٹ

دیں صلاحیں ہمیں کس رنگ کی ماشاء اللہ
خوب ہم جانتے ہیں آپ ہیں جیسے نٹ کھٹ

گالیاں کس لئے در پردہ سُنائیں ہم کو
ناچنے نکلے تو پھر منہ پہ یہ کیسا گھونگھٹ

یاد رہ جائے گی لیکن ہے وہ ٹھوکر کھائی
توسنِ طبع کو اب پھر نہ اُڑانا سرپٹ

اہلِ بنگال نے کیا خوب کیا ہے حملہ
کہ تری فوج مضامین نے ہے کھایا گھونگھٹ

مُنہ دکھانا تجھے واجب نہیں کلکتہ میں
اب مناسب ترے رہنے کے لئے ہے چنہٹ[1]

خوب بوچھار ہوئی چار طرف سے تجھ پر
پائنیر تک کو نہ خوش آئی تری زیٹ زیٹ

[1] لکھنؤ کے قریب ایک قصبہ ہے یہاں غدر ۱۸۵۷ء کی ایک لڑائی میں انگریزوں کو شکست ہوئی تھی۔

کانگرس والے تو کیا خوش نہیں تجھ سے دل میں — دشمنِ ملک علیگڈھ کے پرانے کھوسٹ

تاج وقعت کا اٹھا سر سے ترے چلتے وقت — بے چراغ آئے نظر صبح کو جیسے ڈیوٹ

جس سے ناشاد رعایا ہے وہ ہے دور ترا — کر دیا ملک کو اس پانچ برس میں چوپٹ

بس ترا چل نہ سکا قحط و وبا سے کچھ بھی — شہر ویران ہیں آباد ہوئے ہیں مرگھٹ

اب مناسب ہے یہی کیجیے پنجرا خالی — ہم بھی خوش آپ بھی خوش دور کہیں ہو جھنجھٹ

تو ہو جانے پہ جو راضی تو قسم سر کی ترے — کر کے چندہ تجھے ہم لے دیں ولایت کا ٹکٹ

اور جو تجھ کو نہیں منظور یہ احساں لینا — بھیج دیں ہم تجھے بیرنگ بنا کر پیکٹ

یہی اقرار یہی قول یہی وعدہ تھا — او سخن ساز دغا باز فسونگر نٹ کھٹ

پھونک ڈالے تری اسپیچوں کے بنڈل ہم نے — اب کی ہولی میں جلائے نہیں چیلے سنکٹ

چیمبرلین سے استاد کا شاگرد ہے تو — یاد ہیں مل[1] کے مقولے نہ اصول سگیٹ[2]

کونسل کے جو ترے ممبر سرکاری ہیں — وہ بھی کم بخت ہیں سب چور کے ساتھی گٹھ کٹ

یا الٰہی یہ چلی بادِ مخالف کیسی — آ گیا اڑ کے جو لندن سے یہ کوڑا کرکٹ

ہیں مگر ملک میں دو چار تہمتن یاں بھی — آستیں تیرے مقابل میں جو لیتے ہیں الٹ

یاد رکھ حشر تلک بھی نہ تجھے بھولے گی — گھوکھلے کی وہ چھتھاڑ اور وہ مہتا کی ڈپٹ

چل یہاں سے تو ولایت میں خبر لیں گے تری — چین سے رات کو سوئے گا نہ تو اک کروٹ

[1] ایک انگریزی فلسفی۔ [2] ایک انگریزی مصنف۔

داد خواہوں کا تو بس ہے وہی دربارِ عظیم / پارلیمنٹ میں لکھوائیں گے ہم تیری رپٹ

بچ گیا واں بھی تو پھر حشر میں ہوگا انصاف / کام آئے گی خدا سے نہ تری ریٹ ریپٹ

تالیاں پیٹیں گے رسوائی پہ تیری مظلوم / دیدنی ہوگی قیامت میں تری گھبراہٹ

اب بھی آ ہوش میں اندازِ حکومت کو بدل / مرد ہو کے تجھے واجب نہیں یہ تریاہٹ

سوچ انجام کو اک روز ہے سب کو مرنا / ہے نمک خوار ہمارا تو نہ کر ہم سے کپٹ

بیٹھ کرسیِ وزارت پہ سنبھل کر پیارے / آہِ مظلوم نے شاہوں کے دئے تخت اُلٹ

اب مرا نشہ اُترتا ہے میں ہوتا ہوں خموش / بس ترے واسطے کافی ہے یہی سرٹیفکٹ

آگیا ہوش مجھے کھل گئیں آنکھیں لیکن / اب وہ کرزن نظر آتے ہیں نہ وہ اُن کا چپٹ

میرے مولا مری بگڑی کے بنانے والے / تو ہی تقدیر اب اس خطۂ بیکس کی پلٹ

شاہِ اڈورڈ کا اقبال بڑھا دنیا میں / جس پہ سر پھوڑتے ہیں ہم وہ ہے اس کی چوکھٹ

بس زباں اب نہ ہو تو معرکہ آرائے سخن / رشک سے مرقدِ سودا نہ کہیں جائے الٹ

اے عروسِ سخن اللہ رے جوبن تیرا / لاٹ صاحب کو بھی تاکے ہے تری زلف کی لٹ

حضرت پنچ سے بگڑیں گے تو بن جائیں گے
لاٹ صاحب کو مناسب نہیں یاں گھبراہٹ